اے بی سی آڈٹ بیورو آف سرکولیشن کی مصدقہ اشاعت

فون نمبر ڈائریکٹ ڈائلنگ سسٹم
۳۴۱/۳۴۰
۴۳۵
کوڈ نمبر ۵۲۳۱۷۰

لہٗ دعوۃ الحق
قرآن وسنت کی تعلیمات کا علمبردار
ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک

جلد نمبر ۲۳
شمارہ ۹
شوال ۱۴۰۸ھ
جون ۱۹۸۸ء

مدیر: مولانا سمیع الحق

اس شمارے میں

بدل اشتراک
پاکستان میں ۴۰/- روپے سالانہ ــــــ فی پرچہ ۴/- روپے
بیرون ملک بحری ڈاک ۶ پونڈ سالانہ ــــــ ہوائی ڈاک ۱۰ پونڈ سالانہ

سمیع الحق استاذ دارالعلوم حقانیہ نے منظور عام پریس پشاور سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک سے شائع کیا

نقشِ آغاز

اوجڑی کیمپ راولپنڈی کا اندوہناک حادثہ فاجعہ ملکی اور قومی پریس میں مسلسل موضوعِ زیربحث بنارہا، قائد جمعیۃ مولانا سمیع الحق مدظلہ نے ۱۲ اپریل ۱۹۸۸ء کو ایوانِ بالا سینٹ کے اجلاس سے اس موضوع پر علمی و دینی، اخلاقی وسیاسی اور شرعی نقطۂ نظر سے خطاب فرمایا جو اُس وقت کی مسلم لیگ حکومت اور اسکے فوجی حکمران صدر ضیاء الحق اور پوری قوم کے اربابِ بسط وکشاد کے لیے تازیانۂ عبرت اور مستقبل کے فکر وعمل کی مؤثر دعوت ہے۔ اسکی افادیت کے پیشِ نظر ہم اسے ذیل میں سینٹ سیکرٹریٹ کی رپوٹ سے بعینہٖ نقل کرکے نذرِ قارئین کررہے ہیں، خدا کرے کہ ملکی اور قومی سطح پر اس کے دُوررس نتائج اور مفید ثمرات حاصل ہوں۔ (عبدالقیوم حقانی)

مولانا سمیع الحق جناب والا! میں تحریک پیش کرتا ہوں کہ سینٹ کا حالیہ اجلاس قومی اور فوری نوعیت کے حسب ذیل معاملہ پر بحث کرنے کے لیے ملتوی کیا جائے۔ راولپنڈی میں دھماکوں سے تباہی کی صورتحال اور اس کے اسباب کو زیرِ غور لایا جائے۔

مولانا سمیع الحق جناب چیئرمین! پہلے مجھے موقع دے دیں، میں نے ایک تقریب میں جانا ہے۔

مولانا سمیع الحق میں نے اس تقریب کے سلسلے میں اپنے تمام ساتھیوں کو بھی دعوت دی ہے اور ان سے بھی میری درخواست ہے کہ اس دعوت میں شریک ہوں (یعنی سینیٹر حضرات)۔ (۱۲ اپریل کو سات جماعتی افغان اتحاد کے قائدین کو مولانا سمیع الحق کی جانب سے استقبالیہ کی تقریب تھی)

مولانا سمیع الحق بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ جناب چیئرمین صاحب! یہ ایک بدترین المناک سانحہ ہے جو قیامتِ صغریٰ سے کم نہیں ہے۔ اس پر پاکستان بلکہ دنیا بھر کے مسلمان خون کے آنسو رو رہے ہیں، اور۔ آسمان را حق بود گر خون ببارد بر زمین۔ ایک قسم کی وہ کیفیت سامنے آئی ہے۔ بظاہر یہ ایک حادثہ ہے اور رات جناب صدر صاحب نے بظاہر پریس کانفرنس میں یہ کہا کہ حادثہ وہی ہوتا ہے جس کے اسباب معلوم

نہ ہوں۔ تو ہم بحیثیت مسلمان قوم کے ظاہری اسباب کا بھی تجزیہ کریں گے اور معنوی اسباب بھی اللہ اور اس کے رسولؐ نے ہر معاملے میں بیان کئے ہیں۔ قرآن مجید میں بار بار کہا گیا ہے کہ جو بھی حادثات، تکلیف، مصیبت اور انقلاب آتا ہے اس کے کچھ محرکات اور عوامل ہوتے ہیں اور تکلیف و مصیبت جو بھی آتی ہے اس میں اللہ کی طرف سے ایک تنبیہ بھی ہوتی ہے۔ اللہ کی طرف سے یہ ایک نمونۂ عذاب سامنے آیا اور بڑی سے بڑی طاقت والے مقامات بھی اس حادثہ کی زد سے بچ نہیں سکے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے ہمیں تنبیہ کی کہ کسی وقت بھی ہیری گرفت آپ کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے۔ ہمیں بحیثیت مسلمان ارکان اسمبلی اس صورتحال کو بھی سامنے رکھنا چاہیئے۔ ہم جب اللہ تعالیٰ کی منشاء اور مرضی کے خلاف اس سے منہ موڑیں گے اور اللہ کے غضب کو دعوت دیں گے تو ایسے حادثات ظہور میں آئیں گے۔ بحیثیت مجموعی ہم نے اپنا رخ صحیح سمت سے موڑ لیا ہے اور اللہ کی طرف سے یہ تعزیرات اور تنبیہی کوڑے مسلسل پاکستان پر مختلف شکلوں میں آ رہے ہیں اگر ہم نے اس نقطۂ نظر پر غور نہ کیا تو یہ سارا مسئلہ رائیگاں جائے گا اور بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے خطرات کا سامنا کرنا پڑے گا، اللہ تعالیٰ ہم سب کو محفوظ رکھے۔

جناب! آپ خود دیکھیں کہ پوری قوم کا رُخ کس سمت پر موڑا جا رہا ہے۔ اسی رات قوم کے اہم لوگوں نے لیاقت جمنازیم میں دنیا کے فنکاروں کو جمع کیا اور طاؤس و رباب اور رقص و سرود میں ساری رات گذاری تھی اور ایسی افسوسناک صورت تھی کہ کل اخبار میں تھا کہ انتظامیہ کے سارے اہم حکام اس میں تھے۔ لوگ پوسٹمارٹموں کے لیے عام معمول کے کمشنر سے جو منظوری لیتے ہیں، اُن کو وہاں سے لاشوں کو اٹھانا مشکل تھا۔ یہ حادثہ سے پہلے کی رات جو اتفاقیہ اموات تھیں وہاں انتظامیہ کا کوئی ذمہ دار افسر نہیں تھا سرٹیفکیٹ دینے کے لیے کہ لوگ بغیر پوسٹ مارٹم کے لے جا سکتے ہیں۔ کل اخبار میں تھا کہ کتنے لوگوں کو تکلیف ہوئی۔ پوری قوم طاؤس و رباب اور چنگ و رباب میں لگی ہوئی تھی — آپ خود سوچئے کہ ایک ایکٹر آیا ہے، بھارت کا فلمی ایکٹر ہے۔ وزیر اعظم، صدر مملکت اور تمام حکام اور سربراہ اس کے آگے پیچھے پھر رہے ہیں، اس کو دعوتیں دے رہے ہیں، استقبالیے ہو رہے ہیں۔ کیا کبھی ایسا ہو سکتا ہے کہ پاکستان کا کوئی ایکٹر بھارت جائے تو اس کی اتنی پذیرائی، اتنی فراخدلی اور اتنے کھلے دل سے راجیو گاندھی یا اندرا گاندھی استقبال کر سکتے ہیں؟ جیسے عالم اسلام کا بہت بڑا خالد بن ولید یا طارق بن زیاد آیا ہو کہ پوری قوم اس کی پذیرائی میں لگی ہوئی ہے، اور ساری رات ہم وہاں بھی اللہ کے غضب کو دعوت دیتے رہے۔ یہ مولویانہ بات نہیں ہے بلکہ ہم سب بحیثیت مسلمان قرآن اور اللہ کے احکام سے واقف ہیں۔ ع شمشیر و سنان اوّل طاؤس و رباب آخر جب طاؤس و رباب اور کھیل کود میں ساری قوم لگ جائے تو پھر بلا وجہ یہ سب کچھ نہیں ہوتا، یہ تو اللہ کی رحمت اور

اس کا کرم ہے کہ ہمیں تھپیڑ تو دیتا ہے ہلاک نہیں کرتا۔ یعنی ایک لاکھ تک بم اور میزائل پڑے ہوئے ہیں اور اکثر نہیں پھٹے ہیں جو پھٹ بھی گئے ہیں تو نقصان کم ہوا ہے، یہ اللہ کی طرف سے ایک تازیانہ تھا ورنہ میں کہتا ہوں کہ اتنے بڑے حادثے میں ہزاروں افراد بھی ہلاک ہو جاتے تو کم تھا، اللہ کی رحمت تو ہمارے شاملِ حال ہے لیکن ہم اس کا شکر یہ ادا نہیں کرتے۔

یہاں دارالخلافہ ہے، حساس ایریا ہے اور پھر اس کے ساتھ ہمارا ایٹمی پلانٹ کا منصوبہ بھی ہے تو ایسی بے احتیاطیاں اگر ظاہری طور پر ہوئی ہیں تو اس کا پورا جائزہ لینا چاہیئے ورنہ خدانخواستہ کہوٹہ اور ایٹمی ری ایکٹر بھی اس کی زد میں اگر کہیں آجاتا اور کئی میزائل وہاں بھی اثر انداز ہو سکتے تھے۔ تو اس میں بہر حال کچھ نہ کچھ غفلت اور کوتاہی تو ہے۔ اتنا بڑا ذخیرہ کسی جگہ ہو اور اس کے لیے حفاظتی تدابیر کما حقہ نہ ہوں تو یہ پوری قوم کے لیے، ملک کے لیے خطرے کی گھنٹی ہے۔ ایسے ڈپو صوبہ سرحد میں بہت زیادہ ہیں، پشاور میں ہیں، حیات آباد میں ہیں، کوہاٹ میں ہیں، بنوں میں ہیں، ہمارے نوشہرہ میں بہت بڑا ایمونیشن ڈپو ہے، تو وہاں بھی فوری طور پر احتیاطی اقدامات کرنے چاہئیں اور جو آباد اور گنجان علاقوں میں ہیں وہاں سے ان کو منتقل کیا جائے۔ اور اگر اس میں کوئی تخریب کاری ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے، اس وقت بھارت اور امریکہ اور رُوس وہ سب مل کر تقریباً ایک پریشر ہم پر ڈالنا چاہتے ہیں اور ہمیں اپنی مرضی کے مطابق چلانا چاہتے ہیں —— عالمی پالیسیوں میں تبدیلی آئی ہے اور وہ ہمیں مجبور کرنا چاہتے ہیں کہ ہم ان کی مرضی کے مطابق فیصلے کریں، یہ بھی اس کی ایک کڑی ہو سکتی ہے کہ شاید ہمارے اس عظیم کاز کو جو افغان مجاہدین کے ساتھ ہماری وابستگی ہے اور جہاد، اس کو کہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہو۔ تو یہ ساری صورتحال اس معاملے میں پوری طرح یعنی زیرِ غور لانا چاہیئے۔ میں اس تجویز سے بھی اتفاق کرتا ہوں کہ یہ چونکہ فوج کی ذمہ داری تھی اور اس کا تعلق وزارتِ دفاع سے تھا، تو اس کی تحقیقات فوج سے نہ کرائی جائے بلکہ سپریم کورٹ کے ججوں کی ایک کمیٹی بنائی جائے کہ وہ اس معاملے کی تحقیقات کریں اور بہر حال ہم اس غم میں پوری قوم کے ساتھ شریک ہیں، دُکھ میں شریک ہیں اور تمام جو شہید ہونے والے افراد ہیں اُنکو اللہ تعالیٰ عظیم درجات سے نوازے اور انکے پسماندگان جو ہیں انکی مصیبتیں اللہ تعالیٰ دور فرمادے اور جو بے گھر ہو چکے ہیں، جن کے اعضاء ختم ہو چکے ہیں حکومت کو چاہیئے کہ اس پر فوری توجہ دے اور ہنگامی حالات کی بنیاد پر ان کو امداد فراہم کی جائے۔

ڈیرہ اسمٰعیل خان میں شیعہ سُنّی مسئلہ پر تحریکِ التواء اور تقریر

مولانا سمیع الحق | جنابِ چیئرمین صاحب! میں بھی اس معاملہ میں ضروری سمجھتا ہوں کہ حکومت ایک

غیر جانبدار تحقیقاتی کمیٹی قائم کرے تاکہ بروقت اس معاملہ کی صحیح صورتِ حال قوم کے سامنے آجائے۔ ورنہ خدانخواستہ یہ کشیدگی آگے زیادہ بڑھ سکتی ہے مجھے خطرہ ہے۔ پچھلے سال حکومت کی کوششوں سے دونوں مکاتبِ فکر کے لیڈروں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا، اور اس معاہدے سے یہ دیرینہ کشیدگی اور فسادات ختم ہوکر صورت حال صحیح ہوسکتی تھی۔ لیکن اب جو نقشہ سامنے آیا ہے اس سے یہ خطرہ ہے کہ آئندہ اس معاہدہ کو بھی ملحوظ نہیں رکھا جائے گا اور دوبارہ وہی صورتِ حال پیدا ہوجائے گی جس پر اس معاہدے کے ذریعے کنٹرول کیا گیا تھا۔ اس لیے فوری طور پر ایک تحقیقاتی کمیٹی ہائیکورٹ کے ججوں کی نگرانی میں بنانی چاہیئے تاکہ اس کے بارے میں صحیح رپورٹ اور صورتِ حال قوم کے سامنے آسکے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ پولیس پر زیادہ تشدد کیا گیا ہے اور پولیس بے بس رہی اور ایک طبقے کے تشدد کا نشانہ بنی رہی۔ حکومت اس سارے معاملے کا فوری نوٹس لے، اس طرح نہ ٹالے کہ یہ ایک صوبائی مسئلہ ہے، اس کی جڑیں سارے ملک میں پھیلی ہوئی ہیں کسی جگہ بھی یہ مسئلہ نظر انداز کردیا گیا تو وہ آگ سارے ملک میں پھیل سکتی ہے۔

مولانا سمیع الحق اب بھی ہم یہ کہیں گے کہ خدارا چیمبر میں BILL نہ کریں، میں ان کی اس بات سے اتفاق نہیں کرتا ہوں۔ کوئی مسئلہ ہوتا ہے، ہم تو اسے اخلاص سے پیش کرتے ہیں کہ سامنے آجائے۔

افادات : شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہ
ضبط و ترتیب : مولانا شیر بہادر حقانی شریک دورۂ حدیث

دینی مدارس کا تاریخی پس منظر

قیام اور استحکام کی ضرورت اور برکات و ثمرات

مورخہ ۲۳ شوال ۱۴۰۰ھ بروز جمعرات دارالعلوم کے نئے تعلیمی سال کے افتتاح کے موقع پر حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہ نے درس ترمذی سے مختصر افتتاحی تقریر فرمائی، ذیل میں وہی خطاب ٹیپ ریکارڈ سے من وعن نقل کر کے نذر قارئین ہے ——— (ادارہ)

میرے محترم بزرگو! بدقسمتی سے میں بیماری کی وجہ سے جیسا کہ پہلے عادۃ تھی تفصیل سے معروضات پیش کرنے سے قاصر ہوں، تبرکاً آپ حضرات کے تعمیل ارشاد کی خاطر حاضر ہوں اور اللہ کریم سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ہم سب کو ہمیشہ کے لیے صحت نصیب فرماوے اور تاکہ آپ سب کی خدمت میں اور دین کی خدمت میں اپنا وقت صرف کروں اور یہی میرے لیے موجب سعادت ہے اور خدا تعالیٰ کسی کو بھی اس سعادت سے محروم نہ رکھے۔

اس وقت دو باتیں آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں ——— سند کا کچھ حصہ تو وہی ہے جو میں نے حضرت شاہ ولی اللہؒ تک بیان کیا اور باقی حصہ ترمذی میں موجود ہے ——— ہر حدیث کی سند میں رواۃ کے اسمائے گرامی مرقوم ہوتے ہیں۔

پہلی بات یہ کہ ہم مدرسہ کو آئے اور دین کی تعلیم و تعلّم پر اپنا قیمتی وقت خرچ کرتے ہیں۔ آپ کو شاید یہ ایک معمولی چیز نظر آئے لیکن حقیقت میں یہ ایک بہت اہم چیز ہے، جس وقت پاکستان بنا تو ہمارے چند مخلص علماء جمع ہوئے اور یہ مشورہ کیا کہ اس پُرفتن دور میں اسلام کے تحفظ کے لیے کونسی راہ اختیار کرنی چاہیئے۔ تو اُن کی رائے یہ تھی کہ ہمارے بزرگوں اور اسلاف نے جو راہ اختیار کی تھی ہمیں بھی وہی راہ

اختیار کرنی چاہیئے۔

اور وہ طریقہ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی جو ہوئی تھی جس کو جنگ غدر کے نام سے مشہور کیا گیا جس میں ظاہری فتح اللہ تعالیٰ نے کفاروں کو دی تھی، اللہ تعالیٰ کو کچھ ایسا ہی منظور ہوا کہ اہلِ حق و اہلِ دین علماء کثیر تعداد میں شہید ہوئے، قتل کیے گئے، قید ہوئے اور معدودے چند علماء جو باقی تھے وہ جمع ہوئے اور یہ خیال کیا کہ اب اسلام کی خدمت کس طریقہ پر کرنی چاہیئے؟ تو ان بزرگوں نے یہ رائے پیش کی کہ ہم کو اپنے اسلاف کے نقشِ قدم پر چل کر دینِ اسلام کی خدمت کرنا ہو گی۔

تو انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اب تو ان لاکھوں کی فوج کے ساتھ مقابلہ مشکل ہے لیکن اب اس کا مقابلہ دوسرے طریقہ سے کرنا چاہیئے، وہ یہ کہ ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی جائے جس میں مجاہدینِ اسلام تیار کیے جائیں، فکری اور نظریاتی اساسات کا تحفظ کیا جائے۔

تو یہ مدرسہ انہوں نے دارالعلوم دیوبند کی شکل میں تجویز کیا لیکن مدرسہ کے لیے طلباء اور اساتذہ کی ضرورت تھی۔ تو اولاً ایک شاگرد اور ایک استاد نے یہ کام شروع کیا۔ استاد کا نام بھی محمود تھا اور شاگرد کا نام بھی محمود تھا جو آئندہ کے لیے حضرت شیخ الہندؒ بن گئے، ان دونوں استاد اور شاگرد نے دارالعلوم کا افتتاح مسجد میں ایک انار کے درخت کے سایہ میں کیا، اور یوں ایک عظیم انقلابی پروگرام کی ابتداء دارالعلوم دیوبند کی شکل میں ہوئی۔ اور انہوں نے اعلان کیا کہ ہم ان غریب الدیار مسافر طالبعلموں سے ہمیشہ کے لیے ان باطل قوتوں کا مقابلہ کریں گے۔

اس زمانے کے لوگوں نے جب یہ بات سنی تو انہوں نے ان کی ہنسی اڑائی اور کہا کہ ان کے دماغ خراب ہیں، اتنی بڑی طاقت سے بھلا کون مقابلہ کر سکتا ہے۔ ایک طالب العلم اور مُلّا کی کیا مجال ہے کہ اتنی بڑی طاقت کا مقابلہ کر سکے، ان کے ساتھ تمسخر کیا، لیکن علماء اور طلباء نے اپنا کام نہ چھوڑا اور اشاعتِ علم میں ہمہ تن مصروف رہے، تو ایک وقت آیا کہ پاکستان کے ایک صدر جس کا نام مرزا سکندر تھا، یہاں مردان کے ایک گاؤں اتمان زئی آئے تھے تو حاجی محمد امین سمیت چند علماء اس کے پاس آئے اور کہا کہ دین اور اسلام نافذ کریں اللہ نے آپ کو قوت اور حکمرانی عطا کی ہے۔ تو وہ بہت غصہ ہوئے اور اپنی انتظامیہ کو سخت ڈانٹا کہ آپ نے ان علماء کو کیوں میرے پاس آنے کو چھوڑا ہے، ان طلباء کو کیوں چھوڑا ہے، پہلے تو ہم خوش ہو رہے تھے کہ دیوبند ایک مدرسہ ہے اور وہ ہندوستان میں رہ گیا، اب ہر جگہ دیوبندی نظر آتا ہے۔ یہ دیوبندی تو اللہ ہی جانتا ہے کتنے زیادہ ہیں ہمیں تو ان سے چھٹکارا حاصل نہیں ہوتا ہے۔

بہر حال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ایک وقت تو وہ تھا کہ دارالعلوم کے علماء و طلباء کے ساتھ لوگ تمسخر
اور ہنسی کیا کرتے تھے۔ اور ٹھیک ہے ظاہر میں ایک عالم اور طالب علم کا اتنی بڑی طاقت سے مقابلہ کرنا
ناممکن معلوم ہوتا ہے، لیکن مرزا اسکندر جو اس طاقت کا ایک آدمی ہے وہ سر پیٹتا ہے اور کہتا ہے کہ
اِن مُلّاؤں سے تو چھٹکارا حاصل نہیں ہوتا ہے۔

موجودہ وقت میں آپ دیکھیں رُوس چیخیں مارتا ہے، واپس بھاگنے کو تیار بیٹھا ہے، یہ بھی علماء
اور طلباء سے تنگ ہے اور یہ واضح نظر آرہا ہے۔ پہلے اگر ہم کسی کو یہ بات کہتے تو کوئی نہ سنتا لیکن اب
ہم کہہ سکتے ہیں کہ رُوس جیسی بڑی طاقت کا حشر دیکھ لیں، اور ہمارے ان ضعیف، بے سروسامان،
بے مال و دولت انہی کو اللہ تعالیٰ نے فتح نصیب فرماتا ہے، ارشادِ ربانی ہے: ان تنصروا اللہ ینصرکم

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ مدرسہ اور یہ دارالعلوم دیوبند بھی تحفظ دین کے لیے ایک بنیادی اقدام
تھا، اور اب بھی اس ملک میں یا دیگر ممالک میں جو دین آپ دیکھ رہے ہیں یہ اُس ایک طالب علم اور
استاذ کی کوششوں کا ثمرہ ہے اور انہی کی خدمات ہیں۔ اور آج آپ نے جس مدرسہ میں افتتاح کیا
تو آپ یہ نہ کہیں کہ اس سے ہمیں کیا فائدہ ملے گا، اس سے بھی انشاء اللہ وہی فائدہ ملے گا کہ تھوڑی
مدت بعد روس جیسی سُپر طاقت آپ سے شکست کھائے گی، اور کہیں گے کہ ان طلباء اور علماء
کے ساتھ جنگ کرنا مشکل ہے، اگرچہ وہ خالی ہاتھ ہیں لیکن اللہ کریم ان کی امداد کرتے ہیں۔

تو ایک تو یہ بات ہوئی کہ اس موجودہ وقت میں ہم نے جو یہ کتابیں سامنے رکھی ہیں تو یہ اس
زمانے یعنی ۱۸۵۷ء کو توپ اور فوج کے مقابلہ میں آئی تھیں تو آپ بھی خوش رہیں کہ ہم نے
جہاد کے لیے ایک عظیم طریقہ اختیار کیا ہے، اور حصولِ علم کا عظیم طریقہ اختیار کیا جو مدرسہ میں
پڑھنا ہے اور اس موجودہ دور میں جو دین آپ کو نظر آتا ہے یہ ان مدرسوں کے برکات ہیں تو
بہر حال آپ کی یہ افتتاح اور دینی مدرسہ میں تعلیم شروع کرنا نہایت ضروری اور بہت فائدہ مند ہے۔

اور دوسری بات یہ عرض کرتا ہوں کہ آپ نے اپنے سامنے ترمذی شریف کھولی ہے اور
ترمذی شریف ہم نے شروع کر لی ہے تو آپ کے ذہن میں یہ بات آئے گی کہ بخاری شریف،
مسلم شریف، نسائی، ابوداؤد اور ترمذی شریف، علمائے دیوبند نے ترمذی شریف کو تو شروع
کے لحاظ سے ترجیح دی ہے حالانکہ بخاری اور مسلم کا مرتبہ اس سے زیادہ ہے۔ کیونکہ بخاری
اُس راوی سے روایت کرتا ہے جو متفق علیہ فی التعدیل وطویل الملازمۃ مع الشیخ ہو۔ اور مسلم
اس راوی سے روایت کرتا ہے کہ متفق علیہ فی التعدیل ہو اگرچہ طویل الملازمۃ مع الشیخ نہ ہو بلکہ

امکان لقاء کافی ہے۔ تو ایک تو وہ طالب علم ہے جس نے استاد کے ساتھ دس سال گذارے ہیں اور ایک وہ طالب علم ہے جس نے ایک سال گذارا ہے تو کون ساقوی ہوگا۔ تو ضرور وہی زیادہ قوی ہوگا جو استاذ کے ساتھ زیادہ مدت رہا ہو، بار بار دورۂ حدیث پڑھا ہو۔ تو معلوم ہوا کہ بخاری کا مرتبہ مسلم سے بھی آگے ہے۔ پھر ابو داؤد اور نسائی میں اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں کہ تیسرا مرتبہ نسائی کا ہے کیونکہ نسائی کی شرط یہ ہے کہ شیخ مختلف علیہ فی التعدیل ہو اور طویل الملازمہ مع الشیخ ہو۔ اور بعض کہتے ہیں کہ تیسرا مرتبہ ابو داؤد کا ہے، اور ابو داؤ کی شرط یہ ہے کہ شیخ متفق علیہ فی التعدیل ہو یا نہ ہو امکان اللقا بھی ضروری نہیں ہے۔ اور ترمذی اُس راوی سے روایت کرتا ہے جو متفق علیہ فی التعدیل ہو یا مختلف علیہ فی التعدیل اور امکان اللقاء بھی ضروری نہیں ہے۔

تو یہ ترمذی صحاح ستہ میں پانچویں مرتبہ میں ہے، البتہ اس ترمذی میں چودہ پندرہ علوم ہیں جیسا وہ کہتے ہیں حدیث حسن، غریب وغیرہ، اور راوی کے قوۃ اور ضعف کی نشاندہی کرتے ہیں اور روایت کا درجہ بیان کرتے ہیں۔

تو چونکہ اس میں چودہ پندرہ علوم ہیں، طلباء کو اس میں زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔ تو جو ترمذی پڑھتے ہیں تو وہ چودہ پندرہ علوم بیک وقت پڑھتے ہیں۔ تو ہمارے اساتذہ اور بزرگانِ دیوبند تدریس کے لحاظ سے اس ترمذی کو ترجیح دیتے ہیں۔ تو ہم بھی ان کی تقلید میں افتتاح ترمذی شریف سے کرتے ہیں، اگرچہ مرتبہ کے لحاظ سے پہلے بخاری پھر مسلم پھر نسائی اور ابو داؤد کا ہے، ترمذی کا مرتبہ ان سب سے پیچھے ہے۔

آخر میں میں یہ عرض کروں گا کہ یہ دارالعلوم علماء، طلباء، مخلصین و محبین، معاونین، عامۃ المسلمین نے چلایا ہے اور اس کی بنیاد بزرگوں نے انگریز اور اس کے نظام کے مقابلہ کی خاطر رکھی ہے۔ اور آج ہم کو معلوم ہے کہ بزرگوں کے نیک مشورہ کی برکت سے جو جہاد کا سلسلہ چل رہا ہے یہ سارا اس مدرسہ کی برکت ہے اور اسی کی خدمات ہیں، اللہ قبول کرے۔

میرے محترم بزرگو! تبرک حاصل کرنے کی غرض سے میں نے افتتاح کیا، میں بہت ضعیف ہو چکا ہوں آپ میرے لیے دعا کریں میں آپ کے لیے دعا کرتا رہوں گا ــــ اس کے طلباء اور اساتذہ بڑے مخلص ہیں، جن کی دین کے سوا کوئی غرض نہیں ہے۔ اور اس کے مخلص معاونین جن میں بہت سے ایسے بھی ہیں جو محنت و مزدوری کر کے اپنے لیے دو وقت کا کھانا پیدا کر سکتے ہیں اور پھر ایک وقت کے لیے اپنے آپ کو بھوکا رکھ کر دارالعلوم میں چندہ دیتے ہیں

(بقیہ صـ ۱۹ پر)

جناب ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری

مکاتیب شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

اور اُن کا سیاسی پہلو

دہلی میں شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ "حیات اور کارنامے" کے موضوع پر ۱۸، ۱۹ مارچ ۱۹۸۸ء کو سیمنار منعقد ہوا، ذیل کا مقالہ اسی میں پڑھا گیا، جو اب خصوصیت سے قارئینِ الحق کے لیے پیشِ خدمت ہے ——— (ادارہ)

حضرت مجدد الف ثانیؒ کے خطوط کے بعد حضرت شیخ الاسلامؒ کے مکاتیب تصوف، طریقت، شریعت، دعوت، اصلاح، تبلیغ و اشاعتِ اسلام، احیائے دین، تزکیہ، تعلیم کتاب و حکمت، اصلاح فوائد و رسوم، قیام ملتِ اسلامیہ اور وقت کے اہم دینی تقاضوں کے مضامین کا سب سے بڑا مجموعہ ہیں۔

لیکن وقت کے مسائل میں راہنمائی کے سلسلہ میں حضرت مجددؒ اور حضرت شیخ الاسلام کے افکار میں ایک بنیادی فرق بھی صاف نظر آتا ہے۔ حضرت مجددؒ ہندوستان میں مسلمانوں کے دورِ عروج کے مصلح ہیں، اس وقت مسلمانوں کے اقتدار کا سورج نصف النہار پر تھا۔ حضرت شیخ الاسلامؒ ہندوستان میں مسلمانوں کے دورِ زوال اور عہدِ محکومی کے راہنما ہیں، جبکہ مسلمانوں کے اقتدار کا سورج غروب ہو چکا تھا، سلطنت کا نقش مٹ چکا تھا اور ہندوستان کی تاریخ ایک نئے دور میں داخل ہو چکی تھی۔ حالات نے مسلمانوں کو اس دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا جہاں انہیں فیصلہ کرنا تھا کہ اب ہندوستان میں مسلمانوں کے وسیع تر ملی مفادات کا تقاضا کیا ہے، آیا انہیں ملک کی ملی زندگی میں اپنا مقام پیدا کرنا ہے یا اپنے لیے کسی گوشۂ خلوت میں عافیت کی تلاش کرنی ہے؟

بلاشبہ کسی ایسے گوشے کا تصور نہایت خوش کن تھا جہاں مسلمان اپنی علمی، تہذیبی، دینی روایات کے مطابق زندگی بسر کرنے اور اپنے لیے ایک کامل آزادانہ ماحول پیدا کرنے اور اپنے ذوق و فکر کے مطابق سیاسی زندگی کا نقشہ بنانے میں آزاد ہوں لیکن ہندوستان کی ہزار سالہ تاریخ میں مسلمان اور دوسری اقوام معاشرتی اور سماجی زندگی میں جس طرح گھل مل گئے

تھے ،اس سے انہیں الگ کرنا اور کسی ایک گوشے میں جمع کر لینا ممکن تھا خواہ اس بارے میں کتنے ہی بلند عزائم اور نیک خواہشات کیوں نہ ہوں، مسلمانوں کے وسیع تر اجتماعی مفاد کا تقاضا تھا کہ وہ پسپائی اور فرار کی زندگی کا خیال دل میں لائے بغیر ہندوستان کی اقتصادی، سیاسی اور ملی جلی زندگی میں اپنا مقام پیدا کریں اور ایک وسیع علاقے میں مسلمانوں کے مفادات اور اسلامی دعوت کے بہترین ثمرات اور ملک کے طول وعرض میں اسلامی زندگی کے نشانات، تہذیبی علامات، تاریخی آثار اور اپنے عظیم الشان علمی اور تاریخی اداروں اور مرکزوں کی وراثت سے دستبردار نہ ہوں، خواہ انہیں اس راہ میں وقت کی تلخ کامیوں کا سامنا کرنا پڑے۔

حضرت شیخؒ کے سامنے زندگی کے جو مسائل اور وقت کے جو تقاضے تھے حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کے لیے مسلمانوں کے دورِ عروج اور عہدِ اقتدار کا ملا میں ان کا تصور بھی ممکن نہ تھا۔ حضرت شیخ الاسلام نے دعوؤں کی بلند آہنگی اور ظاہری نمود و نمائش کے مقابلے میں مسلمانانِ ہند کے وسیع تر اجتماعی مفاد کی راہ کو اختیار فرمایا۔ اگرچہ انہیں اس راہ پر چل کر شدید ترین مخالفتوں اور اپنوں اور بیگانوں کی نفرتوں کا ہدف بننا پڑا۔

حضرت مجددؒ کی دعوت مسلمانوں کی اصلاح اور اسلامی زندگی کے قیام کی عظیم الشان تحریک تھی، جس کے اثرات مسلمانوں کے ذہنوں اور ان کی زندگی اور ان کی اصلاحی اور اسلامی تحریکوں پر صدیوں کے بعد آج تک موجود ہیں۔ لیکن جو دور حضرت شیخ الاسلامؒ کو ملا تھا اس میں حضرت مجددؒ کی دعوت کے داخلی رخ ہی سے کام لیا جا سکتا تھا۔ ملک کی ملی جلی اور اجتماعی زندگی کے لیے اس میں کوئی راہنمائی نہ تھی۔ حضرت مجدد کی دعوت کا ایک پہلو کہ غیر مسلموں اور ہنود کو رسوا کرو، ذلیل کرو، انہیں قتل کرو، ان کی قوت مٹا دو، ان کا زور توڑ دو، انہیں سیاسی زندگی میں اقتدار سے الگ کر دو تاکہ وہ عزت کی زندگی سے محروم ہو جائیں اور سر اٹھا کر نہ چل سکیں، نہ اُس وقت قابلِ عمل تھا نہ جہانگیر و شاہجہان کے دور میں بلکہ عالمگیر کے عہدِ سعادت تک اس پر نہ عمل کیا گیا اور نہ کیا جا سکتا تھا۔ حضرت شیخ الاسلام کے عہد کے تقاضے تو بالکل ہی مختلف تھے۔ اِس زمانے میں مسلمانوں کے لیے وہی لائحہ عمل درست تھا جس کی طرف حضرت شیخ الاسلامؒ نے راہنمائی فرمائی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اس دور میں حضرت مجددؒ بھی ہوتے تو اسی سلطانِ وقت اور اسکندرِ عزم کے جھنڈے کے نیچے نظر آتے۔

جانشینیِ شیخ الہندؒ حضرت شیخ الاسلام کے بارے میں یہ بات واضح ہے کہ وہ اپنے عہد میں امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی تحریک کے سب سے بڑے راہنما تھے۔ ان کے سلسلۂ فکر میں اس روایت کی بڑی اہمیت ہے جو ان کے عہد کو حضرت شاہ صاحبؒ کے عہد اور اُن کی تحریک سے ملاتی ہے۔ اس روایت کی شخصیات حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن، حضرت قاسم العلوم مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا مملوک العلی، حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰق و شاہ محمد یعقوب اور حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہم اللہ اجمعین ہیں۔ یہ شخصیات مستقل بالذات بھی تھیں اور الگ الگ نظامِ شمسی کی مالک بھی

تھیں جن سے علم وفضل کے بہت سے ثوابت اور سیارے وابستہ تھے۔ ایک دُوسرے دائرے میں بھی حضرت امام الہندؒ کی روایت موجود تھی، لیکن تاریخی اور روایتی طور پر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے قیام کے بعد تحریک ولی اللّٰہی کا مرکز دہلی سے دیوبند منتقل ہوگیا تھا اور اسی سے متعلق علماء کی ایک جماعت اس روایت کی امین اور تحریک کی داعی تھی۔ بعد میں جب جمعیتہ علماء ہند کا قیام عمل میں آیا اور حضرت مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ شاہجہانپوری ثم دہلویؒ ان کے بعد حضرت شیخ الاسلامؒ اس کے صدر ہوئے۔ اور اس دائرے کے علمائے کرام نے بھی اس کے انداز فکر، نظام اور لائحہ عمل کو اختیار فرمایا، تو گویا ولی اللّٰہی فکر کے مرکز دہلی کے انتقالِ دیوبند پر تاریخ کی مُہر لگ گئی۔

بلاشبہ حضرت شیخ الہندؒ زندہ رہتے اور انہیں جمعیتہ علماء کی راہنمائی کا موقع ملتا تو وہی اس نظام فکر کی مرکزی شخصیت ہوتے لیکن حضرت کو زندگی نے مہلت نہ دی، حضرت مفتی اعظم کے ذوقِ علمی وصحت نے زیادہ دنوں تک جمعیتہ کی رہنمائی کی اجازت نہ دی۔ پھر بھی حضرت مفتی صاحب جمعیتہ علماء کی تاریخ راہنمائی کی ایک قابلِ احترام اور صفِ اوّل کی شخصیت تھے۔ جمعیتہ علماء کی راہنمائی کا سب سے زیادہ طویل عرصے تک حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کو موقع ملا۔ ان کا بواسطۂ شیخ الہندؒ حضرت امام ولی اللہ سے نہایت قوی تعلق تھا، اس لیے وہ نہ صرف جانشینِ شیخ الہندؒ تھے بلکہ اپنے وقت میں حضرت امام الہند محدثِ دہلویؒ کی وراثتِ علم فکری اور فلسفہ عمرانی و سیاسی کے سب سے بڑے داعی اور راہنما وہی تھے۔

حضرت شیخ الاسلام کو نہایت طویل زمانے تک کامل یکسوئی کے ساتھ حضرت شیخ الہندؒ کے فیضانِ تعلیم وتربیت کا موقع ملا تھا، وہ حضرت شیخ الہندؒ کے ذوق ومزاج کے سب سے بڑے آشنا، اُن کے افکار کے سب سے زیادہ واقف اور عزائم کے رازداں تھے۔ حضرتؒ نے اپنے دورِ صدارت میں اور اس سے پہلے سے انہیں افکار وعزائم کے مطابق جمعیتہ علماء ہند کی راہنمائی فرمائی۔

حضرت شیخ الاسلام کا نظام فکر وعمل جمعیتہ علماء ہند وقت کی کسی سیاسی تحریک یا جماعت کی طفیلی نہ تھی نہ کسی سے متاثر۔ اور نہ حضرت شیخ الاسلام کے فکر پر وقت کے کسی سیاسی فلسفۂ نظام کی چھاپ تھی۔ جمعیتہ علماء کا پورا نظامِ فکر مستقل بالذات تھا۔ اس نے سیاسی زندگی کے میدان اور قومی وملی تحریکوں میں جو طرزِ عمل اختیار کیا تھا، وہ اس کے اپنے غور وفکر کے نتیجے میں اس کی اپنی صوابدید پر تھا۔ حضرت شیخ الاسلام کی صدارتِ جمعیتہ کے بہت تھوڑے عرصے بعد ہی جمعیتہ کے نظامِ فکر وعمل اور حضرت کے وجودِ گرامی کا افتراق ختم ہو کر ملک کی سیاسی واجتماعی زندگی میں حضرت کے سیاسی، عمرانی، تعلیمی، دینی اور تہذیبی افکار کا ایک نظام اور لائحہ عمل نمایاں ہوگیا تھا۔

حضرت شیخ الاسلام نے کبھی کسی رجعت پرستانہ فکر وتحریک سے مفاہمت نہ کی لیکن بغیر سوچے سمجھے وقت کی کسی انقلابی اور قومی تحریک کا ساتھ بھی نہ دیا۔ حضرتؒ کے نظامِ فکر کا ذرا بھی غور سے مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوجاتا ہے کہ

ہر فکر اور عمل کا ایک دائرہ ہے اور ہر قسم کے کام ان حدود اور دائروں ہی میں انجام پاتے ہیں مثلاً:۔

(۱) سب سے پہلے مسلمانوں کی اسلامی زندگی کے تقاضے اور ضرورتیں سر اٹھاتی ہیں۔ حضرت ان ضرورتوں کے مطابق مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے لیے زیادہ سے زیادہ ابتدائی اسلامی مدارس کے قیام، تبلیغ و اشاعت اسلام، تنظیم و اتحاد بین المسلمین کے سرزمین ہند میں سب سے بڑے داعی اور مبلغ تھے۔ تاریخ کے ایک دور میں متعدد حضرات نے نہایت جوش کے ساتھ اسلامی مدارس کے قیام، مناظرین کی تربیت، تبلیغ و اشاعت اور اتحاد و تنظیم کی ضرورت کو محسوس کیا۔ اس کے لیے جماعتیں اور انجمنیں قائم کیں، رسالے نکالے، مناظرین کے دستے تیار کیے اور اپنے اوقاتِ عزیز کو ان کاموں کے لیے وقف کر دینے کے عزائم کا اظہار کیا لیکن یہ تمام ولولے وقتی ثابت ہوئے۔ حضرت شیخ الاسلام کے نزدیک یہ کوئی کام بھی وقتی اور کسی خاص تحریک سے متاثر ہو کر کرنے کا نہ تھا۔ بلکہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اسلامی زندگی اور ان کے ملی تشخص کے قیام و استحکام کے لیے دائمی اور مستقل ضرورت تھے۔ جمعیۃ علماء ہند کے نظام میں ان کے مستقل شعبے قائم تھے اور ۱۹۴۷ء تک جمعیۃ کی ۲۸ سالہ زندگی میں یہ شعبے کبھی اپنے راہنما کی عدم توجہ کا شکار نہ ہوئے، نہ اُن کی سرگرمیاں ماند پڑیں، بلکہ ہر آنے والے دور میں بھی نہایت زور شور کے ساتھ ہر دائرے میں کام ہوتا رہا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ اس نے سب سے زیادہ کام کے آدمی پیدا کیے، سب سے زیادہ لوگوں میں خدمت کا ذوق پیدا کیا، سب سے زیادہ تعلیمی، تبلیغی، اصلاحی لٹریچر پیدا کیا، اسلامی مدارس کے قیام میں سب سے زیادہ سرگرمی دکھائی اور پورے ملک میں اسلامی مدارس کا جال بچھا دیا۔ اس نے مناظرین اسلام کی تربیت کا خواہ کوئی مدرسہ نہ کھولا ہو لیکن اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور فتنہ ارتداد کے انسداد کے لیے سب سے زیادہ مخلصین اسی نے پیدا کیے اور سب سے زیادہ منظم اور نتیجہ خیز تحریک اسی نے چلائی۔ اسی طرح جمعیۃ علماء ہند کے تمام بزرگ اور خورد اگرچہ اپنے معتقدات میں نہایت راسخ اور اپنے مکتبۂ فکر سے نہایت قوی تعلق رکھتے تھے لیکن اتحاد بین المسلمین کی سب سے اہم اور موثر تحریک جمعیۃ علماء ہند ثابت ہوئی۔

(۲) مسلمانوں کی ملی و اسلامی اجتماعی زندگی کے قیام کے لیے داخلی امور کی انجام دہی کے ساتھ قومی اور دستوری سطح پر شریعت بل پاس کرانے، قاضی ایکٹ کے نفاذ اور اسلامی اوقاف کی تنظیم و اصلاح کے لیے جو مردانہ وار جنگ لڑی گئی اُس کا سہرا جمعیۃ علماء ہند کے سر ہے اور جمعیۃ کی راہنمائی کا فخر سب سے زیادہ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی علیہ الرحمۃ کی ذاتِ گرامی کو حاصل ہے۔ اگرچہ حضرتؒ نے اس پر فخر کا کبھی اظہار نہیں فرمایا۔

(۳) قومی سطح پر اور ملک کی اجتماعی زندگی کے دائرے میں اسلامی عقائد و شعائر کے تحفظ کے لیے کوششیں کی گئیں۔ جمعیۃ علماء ہند نے ہمیشہ ان تجویزوں اور قرار دادوں کی مخالفت بھی کی جو کسی قومی یا غیر قومی جماعت یا کسی فرد یا حکومت کی طرف سے پیش کی گئیں۔ سول میرج کے بل اور شاردا ایکٹ کی اس بنیاد پر مخالفت کی گئی کہ اس

سے اسلامی زندگی کی روایت، اس کا تشخص اور استحقاق مجروح ہوتا تھا اور یہ شریعتِ اسلامی میں ایسی مخالفت تھی کہ اگر ایک مرتبہ اس کی اجازت دے دی جاتی تو پھر اس دروازے کا بند کرنا ناممکن ہو جاتا۔

اسی طرح جمعیۃ علماء کے اکابر نے جس کے سرخیل حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ تھے، ہر اُس تجویز و تحریک کی مخالفت کی جو مسلمانوں کے ملی و اجتماعی مفاد اور اسلامی عقائد کے خلاف پائی گئی اور اس میں کبھی کسی بڑی سے بڑی شخصیت سے تعلق اور اس کا احترام مانع نہ ہوا۔ تاریخ کی شہادت موجود ہے کہ نہرو رپورٹ کو مسلمانوں کے مفاد کے تحفظ کے لیے ناکافی یا خلاف پایا تو اس کی مدلل مخالفت کی اور پوری سنجیدگی کے ساتھ اس کی خامیوں کو گنوایا۔ واردھا تعلیمی اسکیم اور ودیامندر کی اسکیم کو مسلمانوں کے دینی و تہذیبی افکار و روایات کے خلاف پایا تو اس پر تنقید کرنے میں زبان و قلم نے کوتاہی نہ کی۔ بندے ماترم کا قومی نغمہ اسلامی عقائد سے ٹکرایا تو اس کی قومی حیثیت تسلیم کرنے اور مسلمان بچوں سے اس کے بول کہلوانے سے صاف انکار کر دیا۔ حالانکہ اس کا سخت سے سخت جملہ بھی شاعرِ اسلام کے اس مصرع "خاکِ وطن کا ہر ذرہ مجھ کو دیوتا ہے" اور اس جیسے بہت سے مصرعوں اور شعروں سے زیادہ سخت اور شرمناک نہ تھا۔ اور جب گاندھی جی کی پرارتھنا کے گیت یا ان کے پسندیدہ بھجن کے بعض جملوں کے بارے میں دریافت کیا گیا تو ایک لمحے کے لیے بھی گاندھی سے تعلق اور ان کا احترام یہ کہنے میں مانع نہ ہوا کہ اس کی تعلیم مسلمانوں کے عقائد کے خلاف ہے اور کوئی شخص بقائمی ہوش و بر سلامتی ایمان اسے اپنی زبان سے ادا نہیں کر سکتا۔

④ ملی استحقاق کو منوانے کے لیے جمعیت علماء ہند جس کے صدر نشین حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ تھے، ہمیشہ سینہ سپر رہی۔ خواہ وہ محرم کے جلوس کی بندش ہو یا ذبیحہ گاؤ کی ممانعت یا کسی بزرگ کے عرس کا اہتمام، کوئی بات خواہ اسلام کے مطابق نہ ہو رہی ہو لیکن اگر مسلمانوں کا کوئی فرقہ اسے اپنے عقائد کا جز سمجھتا ہے اور کسی جانور کا ذبیحہ اسلام کی بخشی ہوئی آزادی اور اجازت کے مطابق ہو رہا ہے تو یہ فیصلہ کرنا کہ کیا صحیح اور کیا غلط ہے مسلمانوں کا داخلی اور تہذیبی ملی اصلاح کا مسئلہ ہے، حکومت کو اس میں مداخلت کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ محرم کے جلوس کی اباحت اور کسی بزرگ کے عرس کا اہتمام بھی اسلام کی تعلیم یا اس کے کسی جزئیے سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ ذبیحہ گاؤ کی اجازت تھی تو بنی اسرائیل کی گائے کی طرح ذبح کا حکم قطعی نہ تھا، لیکن حکومت اس معاملے میں حکم نافذ کر کے جس دروازے کو کھول رہی تھی اُس کے کھل جانے کے بعد اس کی دست درازی سے اسلام کا کوئی حکم قطعی بھی محفوظ نہ رہ سکتا تھا۔ یہ معرکہ جمعیۃ علمائے ہند نے حضرت شیخ الاسلام کی صدارت میں سر کیا تھا۔

⑤ قومی اور ملکی سطح پر جمعیۃ علمائے ہند اور اس کے اکابر نے ہر اُس تحریک میں بھرپور حصہ لیا جو ہندوستان

سے برٹش استعمار کی جڑوں کو اکھاڑنے والی اور آزادی کی منزل کو قریب لانے والی ہو اور اس کے لیے کبھی کسی جانی و مالی ایثار سے دریغ نہ کیا۔ خواہ ترکِ موالات کا پروگرام ہو، بدیشی اشیاء کے ترک یا کھدر کے استعمال کی دعوت ہو، سول نافرمانی ہو یا ستیہ گرہ ہو یا ہندوستان چھوڑ دو کا اعلانِ جنگ ہو یا کسی ریاست میں عوام کے مسائل میں راہنمائی کا مسئلہ ہو، جب بھی اس نے کسی تحریک میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا تو یہ اس کے اپنے غور و فکر کا نتیجہ تھا اور اس کی اپنی صوابدید پر منحصر تھا کسی جماعت کی تقلید سے اس کا کبھی کوئی تعلق نہ ہوا۔ جمیعۃ علماء ہند کا فیصلہ ہمیشہ اسی اصول پر مبنی رہا کہ اس کا تعلق نہ صرف ہندوستان کی آزادی اور ملک کے اجتماعی مفاد سے تھا بلکہ مسلمانوں کا ملی اور اسلامی مفاد بھی اسی کا مقتضی تھا۔

(۶) مالٹا کی قید سے رہائی کے بعد ۱۹۲۰ء کے وسط میں حضرت شیخ الاسلام ہندوستان تشریف لائے تھے۔ اسی وقت سے ملک میں چلنے والی تمام قومی تحریکات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ لیکن جب بھی کسی تحریک یا پروگرام میں کسی جماعت سے اشتراکِ عمل کیا تو اپنے تئیں، اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو بالکل اس کے حوالے نہ کر دیا بلکہ اپنے جماعتی فیصلے کے مطابق، اپنے جماعتی تشخص کے ساتھ مسلمانوں کے ملکی اور بیرونِ ملک مسلمانوں کے عمومی مفاد کے پیشِ نظر کیا۔ ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت ہمیشہ پیشِ نظر رہی لیکن ہمیشہ شرعی حدود کی پابندی کے ساتھ، حضرت شیخ الہندؒ کی نصیحت کے مطابق۔

(۷) جمیعۃ علمائے ہند کے تمام ارکان اور حضرت شیخ الاسلام فرقہ وارانہ فسادات کی روک تھام کے لیے اپنی تمام ذاتی اور جماعتی صلاحیتوں اور وسائل کو بروئے کار لائے مسلمانوں کو نظم و ضبط اور تحمل کی تلقین کی، اپنی طرف سے کبھی آغاز نہ کرنے کی تنبیہ کی لیکن مقابلے میں قدم پیچھے نہ ہٹانے کا بھی مشورہ دیا، اور ہجرت کے مقدس نام پر بزدلانہ فرار کے مقابلے میں بہادرانہ موت کو ترجیح دینے کی تلقین کی۔ جو لوگ فساد میں مظلومانہ مارے گئے تھے اُن کی موت کو شہادت کی موت قرار دے کر حالات کے مقابلہ و مقاومت کے لیے جذبہ پیدا کیا۔

(۸) ملکی زندگی کے دائرے میں مسلمانوں کو اپنے فرض کا احساس دلانے کے لیے حضرت شیخ الاسلام کو نظریۂ قومیت کے حوالے سے بدنام کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن حضرت کی پوری زندگی اور اس کے معمولات اس کے گواہ ہیں کہ اس متحدہ قومیت کے قیام کے لیے نہ تو حضرت نے مسلمانوں کی علیحدہ تنظیم، اسلام کی تبلیغ، مسلمانوں کی اصلاح اور اسلامی تعلیمات کی اشاعت کی ضرورت کو نظر انداز کیا، نہ ان فرائض کی ادائیگی میں کبھی ایک کی کوتاہی واقع ہوئی، نہ حضرت کی وضع و قطع، معمولاتِ روز و شب، اوراد و اذکار، سحر خیزی و عبادت گذاری، درسِ حدیث، تعلیم و ارشاد، مراسلت اور اسفار و تقاریر کے ذریعے مسلمانوں کی خدمتِ اسلامی میں کوئی فرق

آیا۔ بلکہ آپ نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا واحد راستہ یہ بتایا کہ صرف نام کے مسلمان نہ ہوں، عادات و اطوار، سیرت و خصائل اور وضع قطع سے بھی مسلمان نظر آئیں۔ ہمارے نزدیک تو حضرت کے نظریہ متحدہ قومیت کا وہی مفہوم تھا جو حضرت کی وضع و قطع، شکل و صورت، آپ کے معمولاتِ روز و شب اور ملی و ظائف و خدمات میں آپ کے ذوق و انہماک سے ظاہر ہوتا ہے۔

یہ تمام کارنامے حضرت شیخ الاسلام کے نظامِ فکر کے مطابق الگ الگ اور مختلف دائروں میں انجام پاتے رہے۔ یہی حضرت کی سیرت کے خصائص ہیں اور یہی جمعیتہ علمائے ہند کے زریں کارنامے ہیں۔ حضرت کے خطوط، خطبات اور بیانات سے یہ نظامِ فکر اور کارنامے ثابت ہیں۔

حضرت شیخ الاسلام کا نظامِ فکر صرف مسلمانوں کی ملی اور قوم کی اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں ہی کا احاطہ نہیں کرتا بلکہ جس طرح ہماری زندگی فرد سے خاندان، خاندان سے برادری اور سوسائٹی اور اس سے آگے ملکی اور قومی دائرے میں نمایاں ہوتی ہے اور قومی و ملکی دائرے سے بلند ہو کر زمین کے زیادہ وسیع علاقوں اور خطوں کو محیط ہوتی ہے۔ مثلاً:۔ ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ اور ان وسیع علاقوں کے حالات و مسائل اور مشترکہ انسانی فلاح و بہبود کے تقاضے انسانی فرائض اور ذمہ داریوں کا تعین کرتے ہیں۔ اسی طرح ایشیا، یورپ اور افریقہ کی ارضی سطح سے اوپر کل انسانیت کی سطح نمودار ہوتی ہے اور متحدہ انسانیت کے تقاضے سامنے آتے ہیں۔ انسانی نقطۂ نظر رکھنے والے شخص کے لیے خصوصاً اس شخص کے لیے جو الخلق عیال اللّٰہ کے عقیدے پر ایمان رکھتا ہو ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ شخصی مفادات، خاندانی، جماعتی بہبود یا ملک یا اس سے اوپر کسی خاص براعظم یا خطۂ ارض کی فلاح و ترقی کے نظریئے پر اس کی سعی اور عمل کا قدم اور ذہنی و فکری ترقی کا سفر رک نہ جائے بلکہ وہ اس مقام سے بلند ہو کر تمام خلق اور کل نوعِ انسانی کی دنیاوی فلاح اور اخروی نجات کے بارے میں سوچے۔

حضرت شیخ الاسلام کے نظامِ فکر کا یہ آخری نقطہ ہے۔ یہی انسانی اور یہی اسلامی اندازِ فکر ہے۔ اور اسی کو سامنے رکھ کر حضرتؒ کے فکر کی بلندی اور سیرت کی عظمت کے بارے میں فیصلہ کرنا چاہیئے۔

حضرت شیخ الاسلام نے مسلمانوں کی انفرادی زندگی میں تعلیم و تزکیہ کی ضرورت سے لے کر عائلی نظام کی اصلاح، ملک کی عام معاشرتی اور سماجی زندگی میں راہنمائی اور پھر ایک عالمی انسانی معاشرے (یونیورسل سوسائٹی) کی تعمیر تک انسانی زندگی اور اجتماع کی تمام ضرورتوں کو نظر میں رکھا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولینا عبیداللہ سندھیؒ کے علاوہ برصغیر کے سارے طبقہ علماء میں حضرت شیخ الاسلام واحد شخصیت ہیں جن کی تحریرات خصوصاً مکاتیب میں ایک عالمی انسانی معاشرے یا متحدہ انسانیت کا نہ صرف تصور ملتا ہے بلکہ حضرتؒ

نے ایسے واضح اشارے کیے ہیں جن کی راہنمائی میں عالمی انسانی معاشرے کا پورا نظام فکر و عمل مرتب کر لیا جا سکتا ہے۔

حضرت شیخ الاسلام کے مکاتیب، تاریخی و سیاسی مباحث اور مذہب میں اس کے تمام علوم وفنون، اور ان کے متعلقات کے مضامین سے بھرے ہوئے ہیں۔ تصوف و طریقت، اصلاح و تہذیب، تعلیم و ارشاد، ذکر اذکار، اوراد و وظائف، مراقبہ و مجاہدہ کے مضامین الگ ہیں۔ کئی خطوط اسلامی زندگی کے خصائص اور اس کے اختیار کرنے کے فوائد میں ہیں اور گویا بصائر و عبر کا گنجینہ ہیں۔ فلسفے کا ذوق آپ میں نہ تھا لیکن مذہب و فلسفہ کی تفریق کے مطابق حضرت شیخ الاسلام کے وہ خطوط جو مذہب کے دفاع اور خدا کے وجود کے اثبات میں ہیں اور جن میں مذہبی عقائد سے استدلال کے بجائے عقلی دلائل سے کام لیا گیا ہے وہ بنیادی طور پر فلسفہ کا مضمون بن جاتا ہے۔ حضرت نے مذہب کے دفاع میں جو طرزِ استدلال اور اسلوبِ بیان اختیار فرمایا ہے اس سے ایک جدید علمِ کلام کے اصول وضع کیے جا سکتے ہیں۔

حضرت شیخ الاسلام عام معنوں میں مُدبّر نہ تھے، یعنی ایسی شخصیت نہ تھے جو اپنے افکار کی تالیف و تدوین میں مصروف رہتی ہے اور جس کا فکر آفریں دماغ نت نئے نکتے پیدا کر کے دنیا سے تحسین و آفرین کا خراج وصول کرتی ہے۔ حضرت شیخ الاسلام ایک خالص عملی انسان اور صاحب فکر سیاستدان تھے اور جن خطوط میں آپ نے سیاسی افکار و مسائل یا کسی قوم یا جماعت کی سیاسی تاریخ اور کردار کے بارے میں اظہار خیال فرمایا ہے، وہ وقت کے سیاسی مسائل اور حالات کے تقاضے کے حوالے سے ہے نہ کہ محض فکر آفرینی کے شوق میں! اگر آپ کے دور میں وہ سیاسی حالات اور مسائل پیدا نہ ہوتے تو آپ کو چونکہ مدبّر بننے اور اپنی اس حیثیت کو ثابت کرنے اور منوانے کا شوق نہ تھا اس لیے کوئی سیاسی مسئلہ چھیڑنے کی یقیناً ضرورت پیش نہ آتی۔ البتہ ان خطوط اور حضرت کی بعض دوسری تحریروں کے مطالعے سے یہ بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ وہ سیاست میں انسانی معاشیات کی کارفرمائی کے قائل تھے اور اس بارے میں وہ اپنا ایک خاص نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ نیز حضرت کی یہ خوبی تھی کہ وقت کے سیاسی مسائل کو تاریخ کے تعامل اور تناظر کی روشنی میں دیکھتے تھے اور اسی کے مطابق حال و مستقبل میں عام لوگوں، مسلمانوں اور وقت کی تحریکوں کی راہنمائی فرماتے تھے۔

حضرت شیخ الاسلام کے خطوط کی ایک اہم خوبی آپ کا شریفانہ رویہ ہے۔ خطوط میں آپ نے سخت سے سخت تنقید فرمائی ہے لیکن اس میں ذاتی عناد کا کوئی شائبہ نہیں۔ آپ نے شخصاً کسی کی ذات

کو موردِ الزام اور متہم قرار نہیں دیا۔ بعض مقامات پر لہجے میں جھنجھلاہٹ کا احساس ہوتا ہے، لیکن یہ اظہارِ خشمگی اپنے مخاطب سے ہے جو عام طور پر حضرت ہی کا کوئی مُرید، معتقد یا شاگرد ہے۔ ورنہ معلوم ہے کہ ایک جماعت کے اصاغر و اکابر نے حضرت کی شان میں کیا کیا گستاخیاں نہ کی تھیں، لیکن حضرت کی زبان سے ان کے لیے بھی کبھی کوئی درشت کلمہ نہ نکلا بلکہ ہمیشہ کلمۂ خیر ہی فرمایا۔

حضرت شیخ الاسلام نے اپنی زندگی میں ہزاروں خطوط لکھے، بلکہ اتنے چھپ چکے ہیں۔ تشنۂ ترتیب و اشاعت خطوط کی تعداد کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ پچاسوں مضامین و خطبات حضرت کی قلمی یادگار ہیں اور متعدد تصانیف آپ کے ذوقِ تالیف و تصنیف اور علم و فضل پر شاہد عدل ہیں اور بلند پایہ مصنف تسلیم کر لیے جانے کے باوجود آپ کو ادیب اور صاحبِ طرز تسلیم کیے جانے کی طرف ابھی کسی نقاد نے توجہ نہیں کی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ آپ کی تحریرات اور تصنیفات کے موضوعات چونکہ سیاسی، مذہبی اور اسلامی و دینی مباحث ہیں، اس لیے ادیبوں اور نقادوں نے توجہ نہیں کی، اور علماء و فضلاء جو حضرت سے عقیدت و ارادت رکھتے ہیں اُن کی نظر میں اسلوبِ تحریر و نگارش کی حیثیت نہ صرف دوسرے بلکہ تیسرے درجے کی ہے۔ اس لیے ابھی یہ فیصلہ کرنے کا وقت ابھی نہیں آسکا کہ حضرت شیخ الاسلام صاحبِ طرز ادیب اور انشا پرداز بھی ہیں۔

میں خود بھی اگرچہ اس انداز سے حضرت کی تمام تحریرات کا مطالعہ نہیں کر سکا ہوں لیکن جس حد تک غور کیا ہے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ حضرت کا طرزِ نگارش جن عناصر سے مرکب ہے ان میں صحتِ زبان کے ساتھ عام فہم اور سادہ بول چال کی زبان خاص عنصر ہے۔

عبارت تعقیدِ لفظی سے پاک اور صاف و رواں ہے۔ اگرچہ فقہ، تصوف وغیرہ کے مطالب پر مشتمل خطوط میں علمی اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں اور کسی بھی علم و فن کی اصطلاحات عام لوگوں کے لیے کبھی عام فہم نہیں ہوتیں۔ اس کے سوا آپ کی تحریر میں مشکل پسندی کے رجحان کا پتہ نہیں چلتا۔ آپ کو عربی زبان پر مادری زبان کی طرح قدرت تھی اور عربی ادب کی تمام شاخوں اور صنفوں پر آپ کو عبور حاصل تھا۔ فارسی دانی کی کیفیت بھی اس سے مختلف نہ تھی۔ لیکن آپ کی اردو تحریر، عربی و فارسی کی مشکل تراکیب، بعید از فہم تشبیہات و استعارات سے بوجھل اور فہم کے لیے دشوار نہیں۔ آپ نے جا بجا عربی، فارسی اور بھارت کے اشعار، جملوں اور مثلوں سے اپنے افکار و مطالب کی تفہیم کا کام لیا ہے۔

حضرت شیخ الاسلام کے پیشِ نظر ہمیشہ مکتوب الیہ اور مخاطب کی علمی اور ذہنی سطح رہی۔ آپ نے جس مسترشد یا مکتوب الیہ کو جس معیارِ کلام کا مستحق سمجھا اُسی کے مطابق اپنی تحریر کو لفظوں اور جملوں سے

تالیف فرمایا۔ عربی کا حکمت آمیز مقولہ کلموا الناس علیٰ قدر عقولہم آپ کی تحریر کی علمی اور فنی سطح کو متعین کرتا ہے، اس لیے آپ کی تحریر کی ایک اہم خوبی وہ ہے جو ادب کے اکابر کے کلام میں تسلیم کی گئی ہے یعنی : از دل ریزد بر دل خیزد۔ آپ کی تحریر کا تعلق چونکہ دل کے سچے جذبات، نیت کے اخلاص، طبیعت کے سوز، علم کی گہرائی، عقیدے کی پختگی، تاریخ کے حقائق اور دلائل کی محکمی سے ہوتا ہے اس لیے پڑھنے والے کے دل میں گھر کر لیتی ہے۔ اگرچہ ہر قاری کا تاثر جدا ہوتا ہے۔ کوئی آپ کے دل کے سچے جذبات اور اخلاص سے متاثر ہوتا ہے، کسی پر طبیعت کا سوز اثر کرتا ہے اور کوئی آپ کے علم کی گہرائی، مطالعے کی وسعت اور دلائل کی محکمی سے مسحور ہوتا ہے۔ اثر کم و بیش ہو سکتا ہے لیکن ایسا کوئی قاری نہیں ہو سکتا جو کسی پہلو سے کسی درجے میں بھی متاثر نہ ہو۔

بقیہ صفحہ ۹ : دینی مدارس کا تاریخی پس منظر

تاکہ طالبعلم روٹی کھالیں ــــ ایک مرتبہ ایک فوجی میرے پاس آیا تھا اور ایک روپیہ چندہ دے کر رو پڑا اور کہا کہ زیادہ چندہ کی طاقت نہیں ہے، میں مزدوری کر کے دو وقت کی روٹی پیدا کر سکتا ہوں تو ایک وقت کی روٹی نہ کھائی اور یہ چندہ دارالعلوم میں دیتا ہوں ــــ تو اس مخلص کا ہم پر حق ہے کہ اس کو اور اس جیسے ہزاروں مخلصین کو دعاؤں میں یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی سعی و کوشش قبول فرمالیں۔

میرا تو دل چاہتا ہے کہ ان تمام لوگوں کے نام لے لے کر ان کے لیے دعا کریں لیکن یہ ممکن نہیں، البتہ جن لوگوں نے ان قریبی دنوں میں دعاؤں کا کہا ہے یا ابتدائے روز سے دارالعلوم سے وابستہ ہیں، وفات پا چکے ہیں یا زندہ ہیں، معاونین ہیں، چندہ دہندگان ہیں، سرپرست ہیں، یا اساتذہ ہیں یا طلباء ہیں، ان سب کو دعاؤں میں یاد کرتے ہیں اور بہت سے بیمار ہیں ان کیلئے بھی دعا کریں۔ میں آپ کے سامنے ایک مریض بیٹھا ہوں، مجھے جتنا افسوس ہے، جتنی ندامت ہے اور اللہ کے دربار میں اتنی ہی زاری و الحاح، منت و سماجت ہے کہ یا اللہ! مجھے بھی اس نعمت خدمتِ دین میں حصہ عطا فرما دے اور اس نعمت میں ہمیں زندہ رکھے اور اپنے بھائیوں کے ساتھ شریک رکھے اور اسی میں موت دے۔ آخر میں تفصیلی دعا فرمائی۔

پاکستان آرمی میں

جونیئر کمیشنڈ آفیسر خطیبوں کی ضرورت

پاکستان آرمی میں جونیئر کمیشنڈ خطیبوں کی خالی آسامیوں کو پُر کرنے کے لیے مطلوبہ قابلیت کے حامل حضرات سے درخواستیں مطلوب ہیں

مطلوبہ قابلیت | (ا) حکومتِ پاکستان کے منظور شدہ کسی دینی مدرسہ سے درسِ نظامی میں فراغت کی سند۔ (ب) پاکستان کے کسی بورڈ سے میٹرک یا سیکنڈری اسکول سرٹیفکیٹ۔ (ج) روزمرہ امور کے متعلق عربی بول چال میں مہارت، قرأت اور حفظ اضافی قابلیت تصور کی جائے گی۔

عمر | یکم اکتوبر ۱۹۸۸ء کو ۲۰ سال سے کم اور ۳۵ سال سے زائد نہ ہو۔

عہدہ اور تنخواہ | ملازمت کیلئے منتخب امیدواروں کو نائب خطیب (نائب صوبیدار) کا عہدہ دیا جائیگا، فوجی وردی کی بجائے منظور شدہ شہری لباس ہوگا جو فوج کی طرف سے مفت مہیّا کیا جائیگا، فوج کے جونیئر کمیشنڈ افسرں کی طرح اوپر والے رینک میں ترقی کی گنجائش ہوگی۔

الاؤنسز و دیگر مراعات | وہ تمام الاؤنسز و مراعات جو فوج کے دیگر متقابل جے سی او صاحبان کو حاصل ہیں انہیں بھی حاصل ہوں گی، مثلاً ذات کے لیے مفت راشن، مفت رہائش (جہاں مہیا ہو ورنہ کوارٹر الاؤنس) اپنے اور بیوی بچّوں کے لیے مفت طبی سہولت، سفری مراعات، پنشن گریجویٹی اور بیمہ کی مراعات وغیرہ وغیرہ۔

ملازمت کی جگہ | پاکستان میں یا پاکستان سے باہر کسی جگہ۔

تربیّت | منتخب اُمیدواروں کو فوجی زندگی سے رُوشناس کرانے کی خاطر خاص تربیت بھی دی جائے گی۔

طریق انتخاب | (ا) مختلف مقامات پر ابتدائی تحریری امتحان (ب) طبّی معائنہ (ج) انٹرویو اور حتمی انتخاب جی ایچ کیو ایجوکیشن ڈائریکٹریٹ میں ہوگا۔

درخواستیں مجوزہ فارم پر اصل اسناد کی تصدیق شدہ نقول کے ہمراہ شعبہ دینی تعلیمات آرمی ایجوکیشن ڈائریکٹریٹ آئی جی ٹی اینڈ ای برانچ جنرل ہیڈکوارٹرز راولپنڈی ۲۳ رجون ۱۹۸۸ء تک پہنچ جانی چاہئیں۔

درخواستوں کے فارم مذکورہ شعبہ دینی تعلیمات سے مبلغ ایک روپیہ ۶۰ پیسے کے ڈاک ٹکٹ لگے ہوئے لفافے بھیج کر حاصل کیے جاسکتے ہیں، نیز مذکورہ بالا فارم فوجی بھرتی کے دفاتر سے بھی حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

فارم طلب کرتے وقت اپنی قابلیّت اور سند الفراغ کے بارے میں پوری معلومات لکھیں۔

نوٹ: انٹرویو میں دو دفعہ ناکام ہونے والے امیدوار درخواست دینے کے اہل نہیں ہیں۔

پاکستان آرمی

PID (I) 4700/10

از مولانا محمد شہاب الدین ندوی،
ناظم فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ، بنگلور (انڈیا)

حج اور اُس کا فلسفہ

ایرانی سازش کے آئینہ میں!

<u>شیعہ اور اسلام</u> | امسال ایرانی شیعوں نے حج کے موقع پر تخریب کاری کرتے ہوئے نہ صرف یہ کہ حج اور بیت اللہ کے تقدس کو پامال کیا بلکہ اپنے آپ کو دنیا کے سامنے بالکل ننگا بھی کر دیا۔ چنانچہ اب تک جو لوگ ایران کے نام نہاد "اسلامی انقلاب" کی جو تھوڑی بہت حمایت کرتے رہے ہیں وہ بھی اس افسوسناک سانحہ کے بعد اس کی مذمت کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ موجودہ ایرانی انقلاب درحقیقت "اسلامی انقلاب" کے نام پر اصلاً ایک "شیعی" انقلاب ہے جو بجائے تعمیر یا اسلام کی سربلندی کے تخریب کاری اور اسلام کی جڑیں کاٹنے کی طرف مائل نظر آتا ہے اور تاریخ اسلام شاہد ہے کہ اسلام کو جتنا نقصان "شیعیت" اور "باطنیت" سے پہنچا ہے۔ اتنا کسی دوسری قوم اور تحریک سے نہیں پہنچا۔

تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو مسلم حکومتوں کے زوال میں زیادہ تر شیعہ وزیروں کا ہاتھ دکھائی دیتا ہے جنہوں نے "بیرونی طاقتوں" سے ساز باز کر کے اپنوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپا۔ چنانچہ عظیم سلطنت عباسیہ سلطنت خداداد ٹیپو سلطان اور سلطنت سراج الدولہ (بنگال) کی شکست و ریخت اس کی واضح مثالیں ہیں۔ جن کے وزیر شیعہ تھے۔ شیعیت دراصل یہودیت کی پیداوار ہے اس لئے یہ دونوں ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی شیعوں کے خفیہ تعلقات یہودیوں سے بہت گہرے نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ امریکی ہتھیاروں کے اسکنڈل اور لبنان کے واقعات سے اس کا پوری طرح ثبوت مل چکا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ اپنی مقصد برآری کے لئے جھوٹ بولنا یا دنیا والوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنا شیعوں کے نزدیک بہت بڑی عبادت ہے جس کو ان کی اصطلاح میں "تقیہ" کہتے ہیں اور ان کے نزدیک دین کے نو حصے "تقیہ" میں پوشیدہ ہیں۔ چنانچہ جب وہ "مرگ بر امریکہ" اور "مرگ بر اسرائیل" وغیرہ قسم کے نعرے لگاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ دل سے ان دونوں کی مذمت کر رہے ہیں بلکہ اپنی مقصد برآری کے لئے بطور "تقیہ" ایسا کہتے ہیں تاکہ دنیا کو دھوکا دے سکیں۔ شیعوں کی اصل فطرت کو سمجھنے کے لئے ان کی تاریخ اور

ان کے مذہب سے واقفیت نہ درہی ہے۔ اور اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ تاریخی حقائق ہیں۔

اسلام کے نام پر ایک فتنہ غرض موجودہ ایرانی انقلاب اسلامی انقلاب ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ اسلام اور عالم اسلام کے لئے ایک بہت بڑا فتنہ ہے جو اس کی تخریب کاری کے لئے برپا ہوا ہے۔ اور عراق، ایران جنگ میں شیعوں کی ہٹ دھرمی، انتہا پسندی اور بے لچک رویہ نے اس کی شہادت فراہم کردی ہے۔ کہ وہ بشمول دنیائے اسلام سارے جہاں کی مصالحانہ کوششوں کو ٹھکرا سکتے ہیں جب کہ وہ دوسری طرف بطور "تقیہ" سارے جہاں کے مسلمانوں کو اتحاد کا نعرہ بھی دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کھلی منافقت ہے۔ اس شرمناک اور بے مقصد بلکہ احمقانہ جنگ نے عالم اسلام کو کھوکھلا کردیا ہے۔ اور اس کے وسائل بجائے تعمیر کے تخریب میں لگے ہوئے ہیں جس کے باعث بہت سے ملک اب کنگال ہو چکے ہیں مگر اس سے بڑھ کر تباہی کی بات یہ ہے کہ شیعوں نے اتنے ہی پر بس نہ کرتے ہوئے اب عالم اسلام کے مرکز مکہ مکرمہ پر پوری ڈھٹائی اور بے حیائی کے ساتھ چڑھائی کردی تاکہ مرکز اسلام پر قبضہ کرکے مسلمانوں میں انتشار برپا کرسکیں۔ اس نقطۂ نظر سے حالیہ خونی ڈرامہ کوئی معمولی "مظاہرہ" نہیں۔ بلکہ ایک بہت بڑی گہری سازش کا جزو ہے جس کی کھچڑی کافی عرصے سے پک رہی تھی۔ اور اس کی جڑیں اسرائیل میں دکھائی دیتی ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ایران اور اسرائیل میں خفیہ طور پر گہری ساز باز چل رہی ہے اور یہ دونوں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ ایران کی ظاہری "اسلامیات" پر اب صرف بہت سے سادہ قسم کے لوگ ہی دھوکا کھا سکتے ہیں واقعہ یہ ہے کہ عالم اسلام کو شیعوں کے زبردست ہتھیار "تقیہ" سے بہت بھاری نقصان پہنچا ہے۔ اور عام مسلمان محض اپنی سادہ لوحی کی بنا پر ان کی چالاکیوں کے دام میں آجاتے ہیں۔ مگر اب جب کہ ان کا بھانڈا چوراہے پر پھوٹ گیا ہے لہٰذا تمام مسلمانوں کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں۔

ایران کا مقصد کیا ہے؟ ایک سچا مسلمان جب حج کے ارادہ سے گھر سے نکلتا ہے تو اس کے سامنے صرف ایک ہی مقصد ہوتا ہے۔ کہ وہ اللہ کے گھر کی زیارت اور اس کے دربار میں حاضری دینے کے لئے جا رہا ہے۔ کہ وہ پوری یکسوئی کے ساتھ اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرکے اپنے گناہوں کو دھوئے اور روح کے داغ دھبوں کو صاف کرے لہٰذا وہ ایک اندرونی کیفیت اور ایک شدید شرمساری کا حال طاری کرتے ہوئے عجز و انکساری کے ساتھ اپنے گناہوں کی بخشش اور اپنے کردار کے میل کچیل کو صاف کرنے کی غرض سے بیت اللہ کا رخ کرتا ہے۔ کیونکہ حج کی سعادت بار بار نصیب نہیں ہوتی۔ اور وہ لوگ تو بڑے ہی خوش نصیب اور خوش بخت ہوتے ہیں جن کو عمر میں صرف ایک مرتبہ حج کرنے کی سعادت مل جائے۔ اس اعتبار سے ایک حاجی عجز و انکسار کی تصویر مجسم ہوتا ہے جو لڑائی جھگڑے یا دوسروں کو تکلیف دینے کی بات کبھی سوچ بھی نہیں سکتا۔ مگر حالیہ برسوں میں عموماً اور

امسال خصوصاً مکہ مکرمہ اور حرم شریف کے اطراف ایرانیوں نے جو خونی ڈرامہ اسٹیج کیا ہے اس سے پوری طرح عیاں ہوگیا ہے کہ ایرانی حج کی نیت سے نہیں بلکہ مرکز اسلام میں تخریب کاری کرنے اور مسلمانوں کو برگشتہ کرنے کی نیت سے آتے ہیں۔ اور حاجیوں کے بھیس میں زیادہ تر ان کے لڑاکو لوگ (پاسداران انقلاب کے آدمی) ہوتے ہیں۔ جن کو پُر تشدد کارروائیاں کرنے کی خصوصی تربیت دی جاتی ہے۔ چنانچہ وہ گذشتہ سال ۵۵ کلو پلاسٹک بم کا مادہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ جو ایک خطرناک دھماکہ خیز چیز ہے۔ جسے کسٹم کے افسروں نے ایرانیوں کے بیگوں کے خفیہ خانوں سے برآمد کیا۔ اگر یہ چیز پکڑی نہ جاتی تو گذشتہ سال ہی ایک بہت بڑی تباہی آتی۔ یہ سازش جب ناکام ہوئی تو امسال انہوں نے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ اور چاقوؤں وغیرہ کے ذریعہ مسلح ہو کر تشدد برپا کیا اور حرم شریف کے تقدس کو اپنے پیروں تلے روندتے ہوئے خوب ہنگامہ برپا کیا۔ جن میں سینکڑوں بے گناہوں کی جانیں گئیں۔

آٹھ سال پہلے ۱۴۰۰ھ واقع ہونے والے خونی ڈرامے کے بعد یہ دوسرا بڑا واقعہ ہے جو پندرھویں صدی میں پیش آیا ہے۔ حالاں کہ حرم شریف وہ مقام ہے جہاں پر تشدد اور قتل و خون ریزی تو درکنار ایک جوں تک کو بھی مارنے کی اجازت نہیں ہے۔ کیونکہ یہ "امن کا گھر" ہے۔ اور قرآنی تصریح کے مطابق "جو اس میں داخل ہو جائے وہ امن والا ہو جاتا ہے"۔ (آل عمران ۹۷) مگر ایرانیوں نے اپنے مذموم اور ناپاک مقاصد کے لئے خداوند عالم کے عطا کردہ اس پیدائشی امن کی دھجیاں بکھیر دیں۔ اور جی کھول کر اس کی خلاف ورزی کی۔ اپنے کپڑوں کے اندر وہ چاقو اور تیزاب کی بوتلیں چھپائے ہوئے تھے جن کے ذریعہ انہوں نے خصوصیت کے ساتھ سعودی محافظین پر حملہ کر دیا۔ اور کئی کاروں اور موٹر سائیکلوں کو نذر آتش کر دیا۔ وہ اپنے ہاتھوں میں خمینی کی بڑی بڑی تصویریں اور مختلف قسم کے بینر اٹھائے ہوئے مختلف قسم کے نعرے بلند کر رہے تھے۔

اس خونی ہنگامہ کے ذریعہ نہ صرف یہ کہ ۴۰۲ جانیں ضائع ہوئیں اور حرم شریف نیز امن والے شہر کی حرمت تار تار ہو گئی۔ بلکہ تمام حاجیوں پر خوف و دہشت طاری ہو گئی۔ عبادت میں خلل اندازی کا نقصان الگ ہوا۔ ایرانیوں کا مقصد بھی شاید یہی تھا کہ مسلمانوں کو اس "دارالامن" میں اطمینان کے ساتھ عبادت کرنے اور طواف کرنے نہ دیا جائے۔ بلکہ انہیں ہراساں کر کے یا تو بھگا دیا جائے یا پھر "خمینی کی جے" کے ان سے نعرے لگوائے جائیں اور اگر بس چلے تو کعبۃ اللہ کے اندر خمینی کی بڑی بڑی تصویریں بھی آویزاں کر دی جائیں تاکہ لوگ بجائے خدا کے سامنے سربسجود ہونے کے خمینی کے سامنے سربسجود ہوں۔ اسی وجہ سے وہ ہر سال دنیا کے مختلف ملکوں میں حج کے سیمینار منعقد کر کے مکہ اور مدینے کو بین الاقوامی تولیت میں دینے کی تحریک چلا رہے ہیں۔ تاکہ مسلمانوں کے ان دونوں روحانی مرکزوں پر قبضہ کر کے من مانی کر سکیں۔ اور عام مسلمانوں کا رشتہ اسلام سے کاٹ کر انہیں ملحد و بے

بے دین بنا سکیں ۔ یا پھر بجائے مکہ کے تہران یا قُم کو اسلام کا مرکز قرار دے کر شیعیت کی تبلیغ پورے زور شور سے کر سکیں ۔ چنانچہ ان کا بنیادی نعرہ اللہ اکبر کے بعد "خمینی رہبر" ہوتا ہے ۔ گویا اللہ کے بعد نہ تو رسولؐ کا مرتبہ ہے اور نہ ہی کسی دوسری مقدس ہستی کا ۔ حتیٰ کہ حضرت ابراہیمؑ ، حضرت اسماعیلؑ اور حضرت ہاجرہ خاتون کا بھی نہیں جن کی یادگاریں آج حج کے بنیادی مناسک ہیں ۔ اور سب سے بڑی بدبختی کی بات یہ ہے کہ یہ لوگ مدینہ منورہ پہنچ کر خلفائے راشدین (سوائے حضرت علیؓ) اور دیگر صحابہ کرامؓ پر "تبرّا بازی" (ان کی برائی اور مذمت) کرتے ہیں ۔ خاص کر ازواج مطہرات پر جو امت کی مائیں ہیں ۔ اس طرز عمل سے مقدس ہستیوں کے خلاف ان کے انتہائی بغض و حسد بلکہ شقاوت و سیاہ قلبی کا پتہ چلتا ہے ۔ جو ایمان سے محرومی کی واضح علامت ہے ۔

غرض امسال کا سانحہ عالم اسلام کے لئے ایک بہت بڑا انتباہ ہے ۔ کہ وہ اب اس "شیعی" فتنے کی سنگینی کو محسوس کریں ۔ اور اس کے استیصال کی عملی تدبیریں سوچیں ۔ اس ہنگامے کے بعد ایران بجائے اس کے کہ ندامت یا پشیمانی کا اظہار کرتا الٹے سعودی حکومت کے خلاف نئے نئے الزامات عائد کر رہا ہے ۔ جو شیعی ذہنیت کی بخوبی عکاسی کر رہا ہے ۔ اور ہو سکتا ہے کہ وہ اس واقعہ کو بہانہ بنا کر سعودی عرب اور بعض دیگر ممالک کے خلاف نئی کارروائیاں کرے ۔ ایرانی اب تک جس قسم کی ذہنیت کا مظاہرہ کر رہے ہیں ان سے کچھ بھی بعید نہیں ہے ۔

حج کا فلسفہ | مناسک حج کی ادائیگی کے لئے بندہ ایک عاشقانہ مزاج کے ساتھ حرم شریف میں داخل ہوتا ہے ۔ اور جب تک اس کا احرام نہیں اتر جاتا وہ ننگے سر ، پراگندہ بال اور عظمت الٰہی کے جذبے سے سرشار ایک دیوانے کی طرح ارکان حج کی ادائیگی میں اس طرح منہمک رہتا ہے کہ اسے دنیا و ما فیہا کی کچھ خبر ہی نہیں رہتی ۔ اللہ کے گھر کی عظمت و جلال کے سامنے وہ پوری طرح سرنگوں ہو جاتا ہے ۔ اور اس کے دل و دماغ قابو میں نہیں رہتے ایک عجیب و غریب قسم کی کیفیت چھائی رہتی ہے ۔ بلکہ ایک نشہ سا طاری رہتا ہے ۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ گویا وہ سیدھے خدا کے حضور پہنچ چکا ہے ۔ اور یہ کیفیت سوائے مسجد الحرام اور مسجد نبویؐ کے دنیا کے اور کسی بھی مقام پر طاری نہیں ہوتی ۔ کعبۃ اللہ کا ماحول بجائے خود پرہیبت و پرجلال نظر آتا ہے ۔ اور اس پرجلال ماحول میں حاجی کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اب تک کے تمام ناسوتی مقامات سے نکل کر گویا کہ ایک لاہوتی مقام میں آ گیا ہے جو اب تک اس کی نظروں سے پوشیدہ تھا ۔ اس پر ایک بے خودی سی طاری ہو جاتی ہے اور وہ بے تحاشا اپنے آپ کو اپنے آقا و مولا کے قدموں میں ڈالتے ہوئے زار زار رونے لگتا ہے ۔ آنسوؤں کی جھڑیاں رواں ہو جاتی ہیں ۔ دلوں کے بند ٹوٹ جاتے ہیں اور گریہ و زاری اور آہ و فغاں کے نالے بلند ہونے لگتے ہیں ۔ غرض وہ ندامت و شرمساری کی تصویر مجسم بن کر اور اپنے گناہوں کا اقرار و اعتراف کرتے ہوئے توبہ و استغفار کرنے اور آخرت کی کامیابی کے لئے دعائیں مانگتا ہے ۔

بیت اللہ میں داخل ہوتے ہی ایک سچے حاجی کو دنیا اور اس کے علائق کی بے ثباتی کا شدید احساس ہونے لگتا ہے لہٰذا وہ اپنا رشتہ خالق کائنات سے جوڑتے ہوئے عہد کرتا ہے کہ اب میں آئندہ اپنی زندگی بھر دنیا کو حقیر اور ذرہ خاک سمجھ کر بتاؤں گا اور دنیا کی کامیابی کے لئے بلکہ آخرت کی کامیابی کے لئے اپنا مشن جاری رکھوں گا۔ اس لحاظ سے حج اور مناسک حج کی ادائیگی کے دوران اس کا مرکز و محور اور اس کی امیدوں کا مرجع و ماوی صرف باری تعالیٰ کی ذات بابرکات ہوتی ہے۔ یہ حج کا اصل فلسفہ اور بنیادی سبق ہے۔ جو حاجی کعبۃ اللہ سے لے کر اپنے وطن واپس آتا ہے اور پھر اس کے مطابق اپنی پوری زندگی راہ الٰہی میں گذارتا ہے۔

اب ذرا سوچئے تو سہی اس مدہوشی کے عالم میں جب کہ لوگ والہانہ جذبوں کے ساتھ حرم شریف میں جمع الحاح وزاری اور توبہ و استغفار کرتے ہوئے اور خالق کائنات کی حمد و ثنا اور اس کی عظمت و جلال کے ترانے الاپتے ہوئے راز و نیاز میں مصروف ہوں اس وقت کسی قسم کا شور و شرابہ کرنا۔ ان کی عبادت میں خلل ڈالنا یا ان کی توجہ ہٹانا جائز ہو سکتا ہے؟ حاجیوں کی بڑی تعداد عمر میں ایک بار حج کے لئے نہایت دور دراز مقامات سے سفر حج کی صعوبتوں کو برداشت کرتے ہوئے محض عشق الٰہی کے جذبے سے سرشار ہو کر آتی ہے لہٰذا ان کو مناسک حج کی ادائیگی سے باز رکھنا یا ان میں خلل ڈالنا کیا معنی رکھتا ہے؟

مکہ میں تخریب کاری کا انجام | قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ جگہ جگہ نہایت تاکید سے فرماتا ہے کہ حج کے دوران کسی بھی قسم کا جھگڑا کرنا یا کجروی اختیار کرنا جائز نہیں ہے۔ بلکہ وہ حکم دیتا ہے کہ "اللہ کے شعائر" یعنی اس کی نامزد کردہ چیزوں کا احترام کیا جائے اور کسی بھی حال میں ان کی بے حرمتی نہ کی جائے۔ ورنہ ایسا کرنے والے سخت سزا کے مستحق ہوں گے۔

چنانچہ چند آیات قرآنی ملاحظہ ہوں۔

"حج میں کسی بھی قسم کا فحش کام، بدعملی اور جھگڑا نہیں کرنا۔" (البقرہ ۱۹۷)

"اور جو کوئی اللہ کے شعائر کی تعظیم کرتا ہے تو وہ دلوں کی پرہیزگاری کی بنا پہ ہے۔" (حج: ۳۲)

اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ جو شخص اللہ کے شعائر اور اس کی حرمتوں کی تعظیم نہیں کرتا۔ اس کے دل میں تقویٰ کا ایک ذرہ بھی نہیں ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ (دنیا میں) سوائے مکہ کے کوئی شہر ایسا نہیں ہے جس میں عمل سے پیشتر صرف نیت پہ مواخذہ کیا جاتا ہو۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی:۔

"جو کوئی اس میں زیادتی کے ساتھ کجروی کا ارادہ کرے گا۔ تو ہم اسے دردناک عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔"

(حج ۲۵)

یعنی صرف مجرد ارادے پر وہ اس دردناک عذاب کا مستحق ہو جائے گا۔ اسی طرح اس شہر میں برائیاں کئی گنا ہو جاتی ہیں جس طرح کہ نیکیاں کئی گنا ہو جاتی ہیں۔" (احیاء العلوم از غزالی ۱/۲۴۳)

عدیم المثال مظاہرہ | قرآن مجید دلیل ناطق ہے کہ حج اور عمرہ اللہ ہی کے لئے ہونا چاہئے (دیکھئے بقرہ ۱۹۶) اور پھر جگہ جگہ مناسک حج کی ادائیگی کے دوران اللہ کا ذکر کرنے، اللہ کی معزز چیزوں کی تعظیم کرنے اور اس کی تکبیر و تہلیل کرنے کی تاکید کی گئی ہے (دیکھئے حج ۲۵-۳۷)

کیونکہ یہ سب دور ابراہیمی کی یادیں ہیں جن کی "اداؤں" کو اللہ نے ہمیشہ کے لئے زندہ جاوید بنا دیا۔ چنانچہ دونوں باپ بیٹوں نے بے مثال ایثار و للہیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے عشق الٰہی کی جو روشن اور تابناک مثال قائم کی تھی یعنی ایک باپ کا اپنے محبوب واکلوتے لخت جگر کو راہ الٰہی میں قربان کرنا اور ایک سعادت مند فرزند کا بے چون وچرا اس کے لئے آمادہ ہو جانا وہ ایک ایسی لافانی "ادا" ہے جو اللہ کا ایک سچا اور بے لوث عاشق ہی پیش کر سکتا ہے۔ اور حج کے واقعہ میں یہی وہ سب سے بڑا سبق ہے جو ایک حاجی کے سامنے آتا ہے کہ وہ وقت پڑنے پر راہ الٰہی میں اپنی جان جیسی قیمتی چیز کا نذرانہ پیش کرنے سے بھی نہ چوکے۔ ورنہ وہ اپنے دعوائے محبت میں سچا نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ حاجی جب لبیک لبیک کہتا ہوا مناسک حج کی ادائیگی بے محابہ آگے بڑھتا ہے۔ تو دراصل وہ یہی اقرار کر رہا ہوتا ہے کہ اے میرے مالک و آقا! "میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں" اور تیرے لئے میں سب کچھ کرنے کے لئے تیار رہوں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ ہر سال لاکھوں حاجیوں کو اپنے دربار میں بلا کر ان سے عہد و پیمان و قول و قرار لیتا ہے۔

غرض مناسک حج کے دوران ہی نہیں بلکہ فرائض حج کی ادائیگی کے بعد بھی سختی کے ساتھ حکم ہوتا ہے کہ حاجی اللہ کو شدت کے ساتھ یاد کرتے رہیں (دیکھئے بقرہ ۲۰۰) اس کا مطلب یہ ہے کہ حاجیوں کے دلوں میں اللہ اور صرف اللہ کی محبت اس طرح موجزن ہو جائے۔ کہ اس کے مقابلے میں وہ دنیا کی تمام طاقتوں اور ہر طرح کی عیش کوشیوں کو ٹھکرا سکیں۔ اور اپنے اندر اس کا جذبہ و حوصلہ پیدا کر سکیں۔ اور اسی مجاہدانہ جذبے کے ساتھ وہ اپنے اپنے وطن کو لوٹ سکیں یہی وجہ ہے کہ ایک حدیث کے مطابق کہا گیا ہے کہ:

"جہاد کے بعد سب سے بہتر عمل حج مبرور ہے" (بخاری ۲/۱۴۱)

بلکہ ایک دوسری حدیث کے مطابق حج بجائے خود جہاد کے مترادف قرار دیا گیا ہے (ابن ماجہ کتاب المناسک ۴۲)

مجموعی اعتبار سے حج ایک ایسا عمل اور اسلام کا ایک ایسا رکن ہے جس کے برابر کوئی دوسرا عمل نہیں کر سکتا۔ اس میں جو بنیادی روح کارفرما ہے وہ یہ ہے کہ بندہ عشق الٰہی میں ڈوب جائے۔ اور اپنے آپ کو قربان کرنے کے لئے

ہمیشہ نبار رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک حدیث کے مطابق فرمایا گیا ہے کہ:۔

"جس نے اللہ کے لئے حج کیا اور اس میں کسی قسم کی فحش گوئی اور بدعملی نہیں کی تو وہ اس دن کی طرح لوٹا جس میں اس کی ماں نے اسے جنم دیا ہو" (بخاری ۲/۱۴۱)

سنگباری کا فلسفہ اب آپ ہی بتائیے کہ حاجی صاحبان جب اتنے اہم ترین فرائض کی ادائیگی میں مصروف ہوں اور وہ اسوۂ ابراہیمی اور اسوۂ اسماعیلی کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک طرح کی عملی ٹریننگ لے رہے ہوں۔ اس وقت ان کے ذہنوں کو منتشر و پراگندہ کرنا یا انہیں وحشت زدہ کرکے حج کے سب سے بڑے سبق کو ڈائنامیٹ کرنے کی کوشش کرنا کیا ایک الحادی اور شیطانی حرکت نہیں ہے؟ کیا حج کوئی میلہ ٹھیلہ یا کھیل تماشہ ہے کہ اس کو خمینی کا ایک "ایکزی بیشن" بنا دیا جائے؟ کیا حاجی صاحبان خمینی کی تصویریں دیکھنے کے لئے حج کریں؟ کیا حج کا مقصد اتنا فروتر اور گھٹیا ہو سکتا ہے؟ یہ شیعیت کی بازیگری اور فتنہ پروری نہیں تو پھر کیا ہے کہ لوگوں کو صحیح راستے اور صحیح مقصد سے منحرف کر دیا جائے؟

آپ کو معلوم ہے کہ منیٰ میں شیطان (جمرات) کو کنکریاں کیوں ماری جاتی ہیں؟ اس لئے کہ اس نے وہاں پر حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیل کو بہکانے اور ان کے فرائض میں رخنہ ڈالنے کی کوشش کی۔ مگر دونوں باپ بیٹے شیطان کے جھانسے میں آنے کے بجائے اس کو پتھروں سے مار مار کر بھگا دیا۔ آپ کا یہ آئیڈیل بھی امت محمدیؐ کے لئے ایک فریضہ قرار دے دیا گیا۔ اس سے حاجی کو یہ سبق ملتا ہے کہ جو کوئی اللہ کے فرائض کے راستے میں حارج ہونے کی کوشش کرتا ہے وہ ایک شیطانی حرکت ہے جس پر سنگباری کرنی چاہئے۔

غرض کہ ایرانیوں کا مقصد یہ ہے کہ وہ حاجیوں کو "اسوۂ ابراہیمی" سے ہٹا کر "خمینی کی بازی گری" کی طرف پھیر دیں۔ یعنی حج کے اصل مقصد اور اس کی روح کو بگاڑ دیں۔ لہٰذا ایسے "شیطانوں" پر حکم الٰہی کے مطابق سنگ باری ہونی چاہئے۔ یہ سیہ بخت لوگ کسی قسم کی معافی کے ہرگز مستحق نہیں۔ لہٰذا پورے عالم اسلام کو "شعائر اللہ" کی توہین کا بدلہ لینے کے لئے اٹھ کھڑا ہونا چاہئے۔ اور اگر اس معاملے میں ڈھیل دی گئی تو حالات نہ صرف خطرناک ہو سکتے ہیں بلکہ مسلمان خدانخواستہ حج جیسے پانچویں فریضے کی ادائیگی سے محروم بھی ہو سکتے ہیں۔

حج ایک منفرد عبادت ہے حج ایک ایسی عبادت ہے جو دنیا کی تمام عبادتوں سے مختلف ایک منفرد نوعیت کی حامل ہے۔ اور دنیا کی کسی بھی قوم کی عبادت اس خصوصیت میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ حج کے تمام مناسک وارکان بے تابانہ عشق اور وارفتگی کے مظہر ہیں۔ اور تمام حاجی لبیک لبیک کی صدائیں بلند کرتے ہوئے بے خودی کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔ دیگر اقوام کی عبادتیں سوائے ہنگاموں اور ہلڑ بازیوں کے کچھ بھی نہیں ہوتے۔ اور شور وغل سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ خود مشرکین مکہ کے حج کا حال بھی اس سے مختلف

نہیں تھا جیسا کہ قرآن کہتا ہے :-

"کعبہ کے پاس ان کی نماز سوائے سیٹیاں بجانے اور تالیاں پیٹنے کے اور کچھ نہیں تھی" (الانفال ۸؍۳۵)

جس طرح کہ ہندوؤں کے دیوی دیوتاؤں کے جلوس میں ہوا کرتا ہے۔ بالکل اسی قسم کا مظاہرہ اب پندرھویں صدی ہجری میں شیعوں نے کعبۃ اللہ کے قریب شروع کر کے زمانۂ جاہلیت کی یاد تازہ کر دی ہے۔

سیاست کی فریب کاری مگر وہ اس کو سیاست کا بھونڈا سا نام دیتے ہیں : تاکہ اپنی بدعملی، جھگڑالو مزاج اور الحاد پرور رجحان پر پردہ ڈال سکیں۔ مگر اب وہ دنیا کو اور زیادہ بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ کیا سیاست کے یہی معنی ہیں کہ حرم شریف اور اس کے اطراف میں نعرے لگائے جائیں۔ جلوس نکالا جائے۔ اور خمینی کی تصویریں اٹھائی جائیں اور حاجیوں کو خوفزدہ کر کے انہیں مناسک حج کی ادائیگی سے روکا جائے ؟ یہ کس قسم کی سیاست ہے اور شریعت میں اس کا کیا جواز ہے ؟ شور و شغب تو عام مسجدوں میں بھی جائز نہیں چہ جائیکہ کعبۃ اللہ یا مکہ مکرمہ میں جائز قرار دیا جائے۔ جہاں پر حاجیوں کی اکثریت عمر میں صرف ایک بار حج کرنے کی غرض سے نہایت درجہ مشقت برداشت کر کے آتی ہے۔ اس سلسلے میں شیعوں کے استدلال کی مثال بالکل ایسے ہی ہے جیسے کوئی اس طرح کہے کہ اسلام میں چونکہ کھانا کھانے سے منع نہیں کیا گیا لہٰذا وہ بیت الخلاء میں بھی بیٹھ کر کھا سکتا ہے۔ بلکہ ایسا کرنا بہت ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نہ صرف شرارت ہے بلکہ یہ مزاج درحقیقت ایک مریض ذہن کی پیداوار ہے اگر شیعوں کے دلوں میں ذرا بھر بھی ایمان ہوتا تو وہ اس قسم کی بے ہودہ حرکتیں کبھی نہ کرتے۔ انہیں نہ تو اسلام اور قرآن پر یقین ہے اور نہ ہی وہ خدا کی عظمت و بزرگی کے قائل نظر آتے ہیں۔ (شیعہ مذہب کی اصلیت عام مسلمانوں پر واضح نہیں ہے) بلکہ انہیں اگر فکر ہے تو صرف ایک ہی کہ کس طرح مکہ معظمہ اور کعبۃ اللہ پر قبضہ کر کے وہاں پر خمینی اور شیعیت کی "عظمت" کا پھریرا بلند کریں۔ اگر ان کا بس چلے تو کچھ بعید نہیں کہ کعبۃ اللہ کے اندر خمینی کی تصویریں بلکہ ان کے بت بھی (مشرکین مکہ کے بتوں کی طرح) نصب کر کے دور جاہلیت کی یاد تازہ کر دیں۔ یہ ایرانی سازش اسرائیلی سازش ہی کا ایک حصہ معلوم ہوتی ہے۔ تاکہ مسلمانوں سے ان کا مرکز چھین لیا جائے۔ اور انہیں فریضۂ حج کی ادائیگی سے محروم کر دیا جائے مگر وہ اپنے ناپاک ارادوں میں کبھی کامیاب نہ ہو سکیں گے۔

انقلاب ایران سے پہلے عالم اسلام کے قلب میں اسرائیل کی شکل میں صرف ایک ہی خنجر نظر آرہا تھا مگر اب ایران کی شکل میں ایک دوسرا خنجر بھی اس کے سینے میں گھونپ دیا ہے۔ کیا یہ بھی بڑی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ ہے ؟ اس کا جواب آنے والا وقت ہی دے گا۔

حاصل یہ کہ چند استثنائے واقعات کو چھوڑ کر چودہ سو سال سے حرم مکی میں جو امن و سکون نظر آرہا تھا وہ حالیہ ایرانی انقلاب کے بعد پوری طرح غارت ہو گیا ہے۔ اب سر پھرے ایرانی شیعہ نہیں جانتے کہ مسلمان اپنے دین کے

پانچویں رکن کو امن و امان اور آزادی کے ساتھ ادا کرتے رہیں۔ بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ اسلام کا یہ پانچواں رکن جو اسلام کی بین الاقوامی برادری اور مساوات کا نہایت درجہ اعلیٰ نمونہ ہے۔ یا تو پوری طرح تہس نہس ہو جائے یا پھر اسے ایک عضو معطل بنا دیا جائے۔

موجودہ دور فتنوں کا دور ہے اور موجودہ دور میں ایرانیوں کی جارحیت اور انتہا پسندی سب سے بڑے فتنے کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے جس کی وجہ سے سنی مسلمانوں کے لئے خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس وقت دنیا میں مسلمانوں کی آبادی ایک ارب کے لگ بھگ ہے اور ان میں شیعہ چار پانچ کروڑ سے زیادہ نہیں ہیں۔ مگر ان کے تیور بتا رہے ہیں کہ وہ ۹۵ کروڑ سنیوں پر غالب آنا چاہتے ہیں۔ اور اسی لئے ساری دنیا میں شیعیت کا پروپیگنڈہ نہایت زور و شور کے ساتھ کر رہے ہیں۔

صیہونیت (ZIONISM) کی طرح یہ بھی ایک خفیہ تحریک ہے جس کے مقاصد اب آہستہ آہستہ منظر عام پر آ رہے ہیں۔ بہر حال اب وقت آ گیا ہے کہ دنیا کے تمام مسلمان متحد ہو کر اس نئے فتنے اور نئے چیلنج کا مقابلہ پوری طاقت سے کریں۔ اور اس شجر خبیثہ کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکیں۔

نور خدا ہے کفر کی ..... آخری بات یہ ہے کہ ایرانیوں نے جوارِ کعبہ میں خونی ہنگامہ کھڑا کر کے دراصل خدائی جلال و جبروت کو للکارا ہے۔ جس کی سزا انہیں انشاء اللہ مل کر رہے گی۔ اور تاریخ بتاتی ہے کہ اس سے پہلے بھی کعبہ پر قبضہ کرنے بلکہ اس کو ڈھانے تک کی کوششیں ہو چکی ہیں۔ جن میں سے ایک ظہور نبوت محمدی سے کچھ پہلے یمن کے عیسائی بادشاہ ابرہہ کی کوشش تھی۔ جو کعبہ پر چڑھائی کرنے کے لئے اپنے ساتھ ہاتھی بھی لایا تھا۔ مگر ایک معجزہ کے طور پر اس کو اتنی عبرتناک شکست ہوئی کہ وہ ایک یادگار واقعہ بن گیا۔ اور قرآن مجید میں سورۂ فیل میں اسی یادگار واقعہ کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ جو "ہاتھی والوں" کے نام سے موسوم ہے۔ جس میں دیدۂ عبرت کے لیے ہزار نصیحت ہے۔

ہر محفل کا میزبانِ خصوصی
رُوح افزا
تقریب کی نوعیت پر منحصر نہیں۔ کوئی موقع ہو کیسی ہی محفل ہو،
ضیافت اور مہمان نوازی کے لیے رُوح افزا پیش پیش۔
فرحت، تازگی اور توانائی کے لیے بے مثال
رنگ، خوشبو، ذائقے، تاثیر اور معیار میں لازوال۔
ہر محفل کا میزبانِ خصوصی
رُوح پاکستان۔ رُوح افزا
راحت جان۔ رُوح افزا
ہمدرد
ہم خدمتِ خلق کرتے ہیں
خدمتِ خلق رُوحِ اخلاق ہے
HMD-6, 87
ADARTS
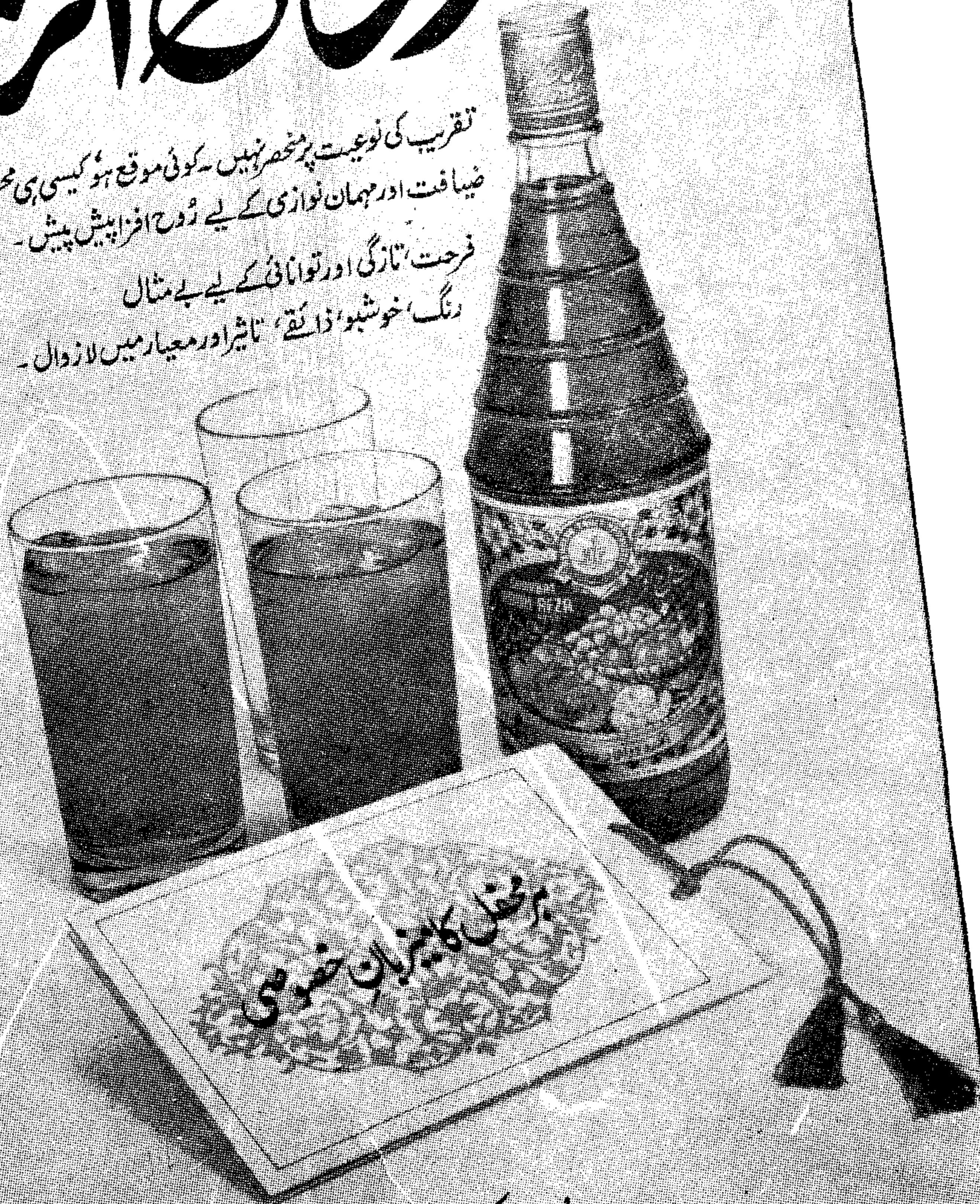
مولانا زاہد الراشدی
ڈپٹی سیکرٹری جنرل جمعیۃ علماء اسلام پاکستان

جہادِ افغانستان کی تازہ ترین صورتحال

محاذِ جنگ کے مشہور جرنیل مولانا جلال الدین حقانی سے انٹرویو

حرکۃ المجاہدین کی دعوت پر مئی ۱۹۸۸ء کے اختتام پر جب ہم نے تیسری بار افغانستان کے اندر جانے کا فیصلہ کیا تو صورتحال یہ تھی کہ جنیوا معاہدے پر دستخط ہو چکے تھے اور نجیب حکومت کے ذرائع ابلاغ زور و شور کے ساتھ اس پراپیگنڈہ میں مصروف تھے کہ افغان مہاجرین کی اکثریت نے جنیوا معاہدہ پر اطمینان کا سانس لیا ہے اور اب وہ قافلہ در قافلہ افغانستان واپس جانے میں مصروف ہیں۔ پاکستان میں بھی جنیوا معاہدہ کو حکومت کی معجزانہ کامیابی ثابت کرنے کے لیے روایتی بیان بازوں کا شور و غوغا کانوں سے مسلسل ٹکرا رہا تھا اور یہ تاثر پھیلانے کی پرزور کوشش ہو رہی تھی کہ جنیوا معاہدہ کے بعد مسئلہ افغانستان اصولی طور پر ختم ہو گیا ہے اور اب صرف یہ کام باقی رہ گیا ہے کہ روسی فوجیں مقررہ مدت کے اندر افغانستان سے واپس چلی جائیں اور اس کے ساتھ ساتھ افغان مہاجرین بھی اپنے وطن لوٹ جائیں۔

لیکن اس قسم کے تاثرات کی فضا میں ۲۹ مئی کو حرکۃ المجاہدین کے امیر مولانا فضل الرحمٰن خلیل اور گوجرانوالہ، سیالکوٹ اور فیصل آباد کے چند احباب کے ہمراہ میرم شاہ میں افغان مجاہدین کے مراکز کو دوبارہ دیکھا، اور پھر ڈیورنڈ لائن عبور کر کے ژاور کے بین الاقوامی شہرت کے حامل مرکز جہاد میں پہنچے تو گوئبلز کے فلسفہ نے اپنے وجود اور کارفرمائی کا ایک بار پھر شدت کے ساتھ احساس دلایا، جرمن ڈکٹیٹر ہٹلر کا دستِ راست گوئبلز یہ کہا کرتا تھا کہ:

"جھوٹ اس تسلسل کے ساتھ بولو کہ لوگ اسے سچ ماننے پر مجبور ہو جائیں"

کیونکہ نہ تو ہمیں مہاجرین کا کوئی قافلہ واپس جاتا دکھائی دیا اور نہ ہی مجاہدین کسی مورچہ سے اپنا سامان لپیٹتے ہوئے نظر آئے، بلکہ جنگ کی تیاریوں میں پہلے سے زیادہ شدت اور اسبابِ جنگ کی فراہمی اور ذخیرہ میں اضافہ کی کیفیت دیکھ کر ہمیں جنیوا معاہدہ کا تانا بانا بننے والے ان سفارت کاروں کی ذہنی حالت

پر رحم آنے لگا جو الفاظ کی میناکاری کے ساتھ دستاویزات کی کاغذی دیوار کے ذریعہ افغانستان کی جنگ کو بند کرانے کی خوش فہمی کا شکار ہو گئے ہیں۔

روسی لیڈر میخائل گورباچوف نے گذشتہ دنوں ایک بیان میں کہا تھا کہ افغانستان سے روسی افواج کی واپسی کو ویت نام سے امریکی فوجوں کی واپسی سے تشبیہ نہ دی جائے کیونکہ دونوں کی نوعیت بالکل مختلف ہے۔ افغانستان میں جنیوا معاہدہ کے بعد کی صورتحال دیکھ کر ہمیں مسٹر گورباچوف کی یہ بات مبنی برحقیقت دکھائی دی۔ کیونکہ ویت نام کے جنیوا معاہدہ اور افغانستان کے جنیوا معاہدے میں دو فرق واضح طور پر نظر آرہے ہیں۔

ویت نام کے مذاکرات میں امریکہ نے چھاپہ مار مزاحمتی گروپوں یعنی ویت کانگ کے وجود کو تسلیم کرکے ویت نام کے مستقبل کا فیصلہ ان کے ساتھ میز پر بیٹھ کر کیا تھا اور اپنی کٹھ پتلی حکومت کے تحفظ اور بقاء پر اصرار کرنے کی بجائے ویت کانگ کی حکومت کے لیے راستہ صاف کر دیا تھا، جبکہ افغانستان میں روسی قیادت افغان مجاہدین کا میز پر سامنا کرنے کی اخلاقی جرأت کا مظاہرہ نہیں کر سکی اور اپنی شکست کے اعتراف کے ساتھ ساتھ اس کے منطقی نتیجہ یعنی دشمن کی فتح کو تسلیم کرنے کا حوصلہ بھی اسے نہیں ہوا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ روس کی فوجی یلغاروں میں واپسی کا یہ پہلا تجربہ ہے، اس سے قبل روس کو اس قسم کی شکست کا سامنا نہیں کرنا پڑا، شاید یہی وجہ ہے کہ وہ شکست کے مسلمہ آداب سے واقف نہیں ہے اور جنیوا معاہدہ شکست کے بارے میں روسی قیادت کی ناتجربہ کاری کا منہ بولتا ثبوت دکھائی دے رہا ہے۔ خیر افغان مجاہدین نے اب بسم اللہ کر دی ہے، شکست کے تجربات میں بھی روسی قیادت کو تہی دامن کی شکایت نہیں رہے گی اور انشاء اللہ العزیز ؏

اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

ویت نام کے ساتھ امریکہ کے معاہدہ اور افغانستان کے بارے میں معاہدۂ جنیوا میں دوسرا واضح فرق یہ ہے کہ ویت نام میں معاہدہ کے بعد جنگ بند ہو گئی تھی اور جنوبی و شمالی میں منقسم ویتنام جنگ بندی کے بعد متحدہ ویتنام کی صورت اختیار کر گیا تھا جبکہ جنیوا معاہدہ کے بعد افغانستان کی جنگ میں شدت اور تیزی پیدا ہو رہی ہے اور روسی قیادت متحدہ افغانستان کو جنوبی اور شمالی کے دو حصوں میں تقسیم کرنے کے لیے مسلسل سازشوں کے جال بچھاتے نظر آرہی ہے۔

ویت نام اور افغانستان کے بارے میں بین الاقوامی معاہدات کا یہ فرق افغانستان کے اندر جاکر اور زیادہ واضح طور پر محسوس ہوتا ہے، کیونکہ جنیوا معاہدہ سے قبل مارچ ۱۹۸۸ء میں جب ہمیں ژاور کے مرکز جہاد اور اس سے آگے رانغبیلی کے مورچوں پر جانے کا موقع ملا تھا تو اسلحہ کی فراوانی اور جنگی جوش و خروش

کا جو منظر اس وقت دیکھا تھا، معاہدہ کے بعد کا ماحول اس سے کہیں زیادہ پُرجوش نظر آیا اور مجاہدین کا عزم و حوصلہ دیکھ کر یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اب آخری اور فیصلہ کن معرکہ کے لیے تیاریاں کر رہے ہیں، ایک ایسا معرکہ جس کی شدت اور تباہ کاری شاید گذشتہ ۹ سالہ جنگ کے مجموعی تاثرات کو بھی ذہنوں سے محو کر دے۔

افغانستان میں ہماری حالیہ حاضری کا مقصد جنیوا معاہدہ سے پہلے اور بعد کی صورتِ حال میں فرق کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ معروف افغان کمانڈر مولانا جلال الدین حقانی کے ساتھ ملاقات بھی کرنا تھا۔ چنانچہ ان سے ان کے میرم شاہ کے ہیڈ کوارٹر میں ملاقات ہوئی اور جہادِ افغانستان کی تازہ ترین صورتحال کے بارے میں مختلف امور پر ان سے بات چیت ہوئی۔ اس ملاقات میں جمعیۃ علماء اسلام صوبہ سرحد کے سالارِ اعلیٰ قاری حضرت گل شاکر، حرکۃ المجاہدین کے امیر مولانا فضل الرحمٰن خلیل، نائب امیر مولانا محمد فاروق کشمیری اور مولانا عبداللطیف بھی شریک تھے۔

مولانا جلال الدین حقانی کا تعلق افغانستان کے صوبہ پکتیا کے علاقہ "شیرانہ" سے ہے، دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے فاضل اور شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق مدظلہ کے شاگرد ہیں، کچھ عرصہ دارالعلوم حقانیہ میں مدرس بھی رہے ہیں۔ وہ سیاسی طور پر "حزبِ اسلامی افغانستان" کے اس دھڑے سے وابستہ ہیں جس کی قیادت مولوی محمد یونس خالص کر رہے ہیں۔ مولوی محمد یونس خالص بھی مولانا عبدالحق مدظلہ کے شاگرد ہیں اور افغان مجاہدین کے اہم راہنماؤں میں شمار ہوتے ہیں۔ مولانا جلال الدین حقانی کے دو نائب مولوی فتح اللہ حقانی اور مولوی احمد گل بھی جنہیں ان کے دستِ راست کی حیثیت حاصل تھی، دارالعلوم حقانیہ کے فاضل تھے۔ ان کی جماعت اور افغانستان میں افغان مجاہدین کی دیگر جماعتوں میں دارالعلوم حقانیہ کے فضلاء کی ایک بڑی تعداد آج بھی مصروفِ جہاد ہے، اور غالباً اس بارے میں پاکستان اور افغانستان کا اور کوئی دینی ادارہ "دارالعلوم حقانیہ" کا ہم پلہ نہیں ہے۔

شاید دارالعلوم حقانیہ کے اس امتیاز و اعزاز کی وجہ یہ ہو کہ شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہ حدیث کی تعلیم و تدریس کے ضمن میں جہاد سے متعلقہ ابواب "کتاب السیر" کا خصوصی ذوق رکھتے ہیں، حتّٰی کہ ضعف اور معذوری کے دور میں جب وہ اپنے تعلیمی ذوق کے تسلسل کو باقی رکھنے یا طلبہ کے شوق کی خاطر کبھی کبھار تھوڑا بہت پڑھانے کا سلسلہ شروع کرتے ہیں تو ان کا انتخاب "کتاب السیر" ہی کا ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں اکثر مدارس میں دورۂ حدیث ہوتا ہے، لیکن عام روایت یہ بن گئی ہے کہ حدیث کی کتابیں پڑھانے والے اساتذہ کا زیادہ زور طہارت اور نماز کے اختلافی مباحث پر صرف ہو جاتا ہے اور اسلامی نظام کے اجتماعی پہلوؤں سے تعلق رکھنے والے ابواب مثلاً خلافت و امارت، تجارت و معیشت،

عدالت و قضا، جہاد و قتال اور بین الاقوامی تعلقات جیسے اہم ابواب سے یوں گذر جاتے ہیں جیسے ان ابواب کا حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور نظامِ اسلام کے ساتھ معاذ اللہ کوئی تعلق نہ ہو یا نعوذ باللہ اب ان کی کوئی ضرورت باقی نہ رہ گئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان مدارس سے فارغ ہونے والے علماء کی اکثریت کی فکر و نظر اور خطبات و مواعظ کی جولانگاہ اختلافی مباحث تک محدود ہو کر رہ گئی ہے اور انہیں اسلام کے اجتماعی نظام سے نہ کوئی شعوری دلچسپی ہے اور نہ ہی وہ جدید نظام ہائے حیات مثلاً جمہوریت، سوشلزم، سیکورازم اور کیپٹل ازم وغیرہ کے ساتھ اسلام کا موازنہ و مقابلہ کر کے نئی نسل کو اسلام کی فوقیت کے بارے میں مطمئن کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہیں، اور بلا شبہ علماء کی فکری و علمی زندگی کا یہ خلاء جدید نظاموں کی طرف مسلمانوں کی نئی نسل کے میلان و رجحان کا سب سے اہم سبب بن گیا ہے۔

خیر بات جہادِ افغانستان میں "دارالعلوم حقانیہ" کے فضلاء کی خصوصی دلچسپی کی ہو رہی تھی کہ اس کی اہم وجہ حدیث کے جہاد سے متعلقہ ابواب کی تعلیم و تدریس کے سلسلہ میں شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہ کا خصوصی ذوق ہے، اور مولانا موصوف کا یہ ذوق صرف تدریس و تعلیم تک محدود نہیں ہے بلکہ اپنے شاگردوں کو جہاد و قتال کے لیے آمادہ کرنا اور اُن کی سرپرستی کرنا بھی ان کے معمولات میں سے ہے اور ان کے اسی ذوق و محنت کا ایک شاہکار مولانا جلال الدین حقانی کی شخصیت ہے۔

مولانا جلال الدین حقانی نے افغانستان کے سابق صدر داؤد کے دور میں جب روسی نظام کی بنیاد پر انقلابی اصلاحات کا آغاز ہوا تھا اور دینی ادارے براہِ راست اس انقلاب کی زد میں آگئے تھے صوبہ پکتیا میں مسلح جہاد شروع کر دیا تھا۔ غالباً وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے کمیونسٹ اصلاحات کے خلاف افغانستان میں ہتھیار اُٹھا کر جنگ کا آغاز کیا، اور اُس وقت سے آج تک کم و بیش بارہ سال کا عرصہ گذر چکا ہے کہ وہ مسلسل مسلح جہاد میں مصروف ہیں اور اس طویل جنگ کے تجربات و مصائب نے ان کی فکر اور صلاحیت میں پختگی پیدا کی ہے جس کا اظہار وہ جہادِ افغانستان میں مکمل کامیابی کے بعد کشمیر، فلسطین، بخارا، تاشقند اور دیگر مقبوضہ مسلم علاقوں کی بازیابی کے لیے مسلح جہاد کے عزم کی صورت میں کرتے ہیں۔

مولانا حقانی کے ساتھ ۳۰ مئی کو ان کے میرم شاہ کے ہیڈ کوارٹر میں ہماری ملاقات اس انداز میں ہوئی کہ ان کے گھر کے سامنے ملنے والے افراد اور وفود کا تانتا بندھا ہوا تھا اور وہ باری باری ان سے نمٹتے جا رہے تھے۔ ہمارے لیے انہوں نے ایک وفد کی ملاقات ادھوری چھوڑ کر وقت نکالا، جب وہ ملاقات کے کمرے میں پہنچے تو اُن کی وضع قطع، لباس اور اندازِ گفتگو کو دیکھ کر قطعاً یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ یہ وہی

گوریلا کمانڈر ہے جس نے روسی افواج کی مسلح یلغاروں کو بار بار عبرتناک شکست سے دوچار کیا ہے اور جس کی گوریلا مہارت کے چرچے بین الاقوامی پریس میں تسلسل کے ساتھ ہو رہے ہیں۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی دینی مدرسہ کا ایک مدرس سبق پڑھاتے ہوئے درمیان میں کسی ضروری کام کے لیے اُٹھ کر آگیا ہے لیکن جب انہوں نے ہمارے سوالات کے جواب میں روسی پالیسیوں اور عزائم کے تار و پود بکھیرتے ہوئے افغانستان کے مستقبل اور اپنے آئندہ ارادوں کا نقشہ کھینچا تو ذہن کے پردۂ سکرین پر محمود غزنوی، صلاح الدین ایوبیؒ، محمد بن قاسمؒ اور محمد فاتحؒ جیسے عظیم مسلم جرنیلوں کی تگ و تاز اور جہد و عمل کے مناظر گھومنے لگے اور دل اس مردِ قلندر کی صحت و سلامتی اور کامیابی کے مجسم دعا بن گیا۔

مولانا جلال الدین حقانی سے خیر و عافیت پوچھنے کے بعد ہمارا پہلا سوال یہ تھا کہ اگر ہم انہیں پاکستان کے مختلف شہروں میں جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کے زیرِ اہتمام جہاد کانفرنسوں سے خطاب کی دعوت دیں تو کیا وہ اسے قبول کر لیں گے؟

انہوں نے جواب میں شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ میں اس کے لیے تیار ہوں لیکن فوری طور پر ایسا ممکن نہیں، کیونکہ چند روز تک افغانستان کی جنگ ایک نئے مرحلہ میں داخل ہو رہی ہے اور میں افغانستان کے اندر محاذِ جنگ پر جا رہا ہوں، ۵ ارذیقعد کے بعد واپسی کی توقع ہے، اس کے بعد جہاد کانفرنسوں کے پروگرام کے لیے باہمی مشورہ کے ساتھ تاریخوں کا تعین ہو سکتا ہے، ویسے بھی اُس وقت تک صورتحال میں کافی تبدیلی پیدا ہو چکی ہو گی اور کئی بڑے شہروں اور علاقوں کو فتح کرنے کے بعد جب ہم جہاد کانفرنسوں میں شریک ہوں گے تو ہماری بات کے وزن اور نوعیت میں کافی فرق آچکا ہو گا۔

اس کے بعد ہم نے مولانا حقانی کو جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کی مرکزی مجلسِ شوریٰ کے اجلاس سے بطورِ خاص خطاب کی دعوت دی جو انہوں نے قبول کر لی اور کہا کہ تاریخ اور جگہ کا تعین بعد میں مشورہ کے ساتھ کر لیا جائے گا۔

ان گذارشات کے بعد ہم نے ان سے سوال کیا کہ جنیوا معاہدہ کے بعد امریکہ اور دوسرے حمایتی ممالک کی طرف سے امداد بند ہونے کی صورت میں جنگ کو جاری رکھنے کی کیا شکل ہو گی اور افغان مجاہدین کی آئندہ حکمتِ عملی کیا ہو گی؟

اس سوال کے جواب میں مولانا جلال الدین حقانی نے کہا کہ ہماری جنگ کا دار و مدار بیرونی امداد پر نہیں ہے بلکہ ہم اسے شرعی فریضہ سمجھتے ہوئے اللہ رب العزت کی رضا کے لیے اسی کے بھروسہ پر جہاد کر رہے ہیں، ہم نے جب جہاد کا آغاز کیا تھا ہمارے پاس برائے نام جنگی وسائل بھی نہیں تھے، کھانے پینے

کی اشیاء نہیں تھیں، آمدورفت کے لیے گاڑیاں نہیں تھیں، زخمیوں کے لیے ہسپتال نہیں تھے اور کسی قسم کا جدید اسلحہ نہیں تھا، اُس وقت ہم نے جنگ لڑی اور روسی فوجوں کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا، آج تو ہماری جنگی صلاحیت اور تجربہ میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے، آج ہم بیرونی امداد کے بغیر جنگ کیوں نہیں لڑ سکتے، ہماری جنگ اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور جہاد کے شرعی تقاضے پورے ہونے تک یہ جنگ جاری رہے گی۔ ہم نے امریکہ یا کسی اور ملک کے کہنے پر جنگ شروع نہیں کی تھی کہ آج اُن کی طرف سے امداد بند ہو جانے کی صورت میں جنگ بند کرنے کی بات سوچنے لگیں، جن لوگوں نے امریکہ کو دیکھ کر جنگ شروع کی تھی وہ بیشک بند کر دیں، لیکن وہ کتنے ہیں، ان کی تعداد کیا ہے؟ اگر وہ ہیں بھی تو افغانستان کی جنگ کے حوالے سے ان کا وجود اور عدم وجود برابر ہے۔ باقی رہی ہماری جنگ تو وہ اللہ کے لیے تھی اور اللہ ہی کے لیے مکمل فتح تک جاری رہے گی۔ جہاں تک اسلحہ اور جنگی اسباب کا تعلق ہے میں آپ کو ایک تجربہ اور مشاہدہ کی بات بتاتا ہوں جب تک امریکہ اور دوسرے ممالک کی طرف سے ہماری امداد شروع نہیں ہوئی تھی ہماری جنگ کا زیادہ تر انحصار اس اسلحہ پر تھا جو ہم روسی فوجوں سے چھینتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے غنیمتوں کے دروازے کھول دیئے تھے، جب امریکی امداد کا آغاز ہوا تو اسلحہ کی غنیمتوں کے اس تسلسل میں کمی آنے لگی، اور آج جب امریکہ اور دوسرے حمایتی ممالک کی امداد کی بندش کی باتیں ہو رہی ہیں اللہ تعالیٰ نے غنیمتوں کے دروازے پھر سے کھول دیئے ہیں، روسی فوجیں جن علاقوں کو چھوڑ کر جا رہی ہیں مجاہدین ان پر بتدریج قبضہ کرتے جا رہے ہیں اور اسلحہ کا ایک بڑا ذخیرہ ان کے قبضے میں آ رہا ہے۔ ہمیں چند روز قبل معلوم ہوا کہ روسی افواج کا ایک بڑا قافلہ خوست آ رہا ہے جس کا مقصد بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ خوست میں موجود روسی کابل فوج اور ساز و سامان کو بحفاظت وہاں سے نکال لیا جائے۔ اس خبر پر ہمیں پہلے کچھ پریشانی ہوئی، لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ کی یہ حکمت سمجھ میں آئی کہ یہ قافلہ اور اس کے ذریعہ مزید اسلحہ اور ساز و سامان بھی ہمارے لیے بھیجا جا رہا ہے اور یہ ہمارے کام ہی آئے گا انشاء اللہ العزیز، اس لیے ہم بے چینی کے ساتھ اس کانوائے کا انتظار کر رہے ہیں۔

مولانا حقانی سے ہمارا دوسرا سوال یہ تھا کہ بین الاقوامی پریس اور سیاسی حلقوں میں اس خدشہ کا مسلسل اظہار کیا جا رہا ہے کہ روس افغانستان سے جاتے ہوئے اسے شمالی اور جنوبی دو حصوں میں تقسیم کرنے کی راہ ہموار کر رہا ہے اور شمالی افغانستان میں نجیب حکومت کو منتقل کر کے مزار شریف کو دارالحکومت بنایا جا رہا ہے۔

اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ دراصل اس خطہ کے لیے روسی حکمتِ عملی تین حصوں پر مشتمل ہے

سب سے پہلے روسی حکمتِ عملی کا ہدف یہ رہا ہے کہ افغانستان میں مکمل قبضہ کے بعد پاکستان کے صوبہ سرحد اور بلوچستان کو قبضہ میں لایا جائے اور اس راستہ سے گرم پانی اور خلیج کے تیل کے چشموں تک رسائی حاصل کی جائے، لیکن روس کو اس حکمتِ عملی میں کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ دوسرے مرحلہ میں روسی پالیسی نے یہ رخ اختیار کیا کہ افغانستان میں کمیونسٹ حکومت اور نظام کو مستحکم کر کے اسے پاکستان میں کمیونسٹ یا کم از کم روس نواز انقلاب کی راہ ہموار کرنے کے لیے استعمال کیا جائے۔ افغان مجاہدین کی دس سالہ طویل جنگ اور بے مثال قربانیوں نے روسی قیادت کا یہ خواب بھی مکمل طور پر بکھیر دیا ہے۔ اب تیسرے مرحلہ میں روسی قیادت یہ چاہتی ہے کہ افغانستان مکمل طور پر مجاہدین کے کنٹرول میں نہ جائے بلکہ افغانستان کی کمیونسٹ آبادی اور قوت کو شمالی علاقہ جات میں مجتمع کر کے مزار شریف میں نجیب حکومت کو منتقل کر دیا جائے۔ روسی قیادت اس مقصد کے لیے اس حد تک سنجیدہ نظر آتی ہے کہ ازبک، ترک اور تاجک اقوام کو جو دریائے آمو کے دونوں طرف آباد ہیں اور افغانستان کے ساتھ ساتھ روس کے مقبوضہ علاقوں میں بھی ان کی خاصی تعداد موجود ہے۔ روس ان اقوام کے اپنے زیرِ قبضہ علاقوں کو خالی کرنے کے لیے بھی تیار ہے تاکہ ان سب علاقوں کو ملا کر ایک مستحکم کمیونسٹ حکومت تشکیل دی جاسکے، اس غرض کے لیے افغانستان میں روس کے حمایتی عناصر کو شمالی علاقوں میں مجتمع کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اور روس اپنے اور مجاہدین کے درمیان ایک کمیونسٹ حکومت کی دیوار کھڑی کرنے کے منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کی تیاری کر رہا ہے لیکن ہم اس تقسیم کو قبول نہیں کریں گے اور ہماری جنگ اُس وقت تک جاری رہے گی جب تک پورا افغانستان کمیونسٹوں کی تحویل سے نکل کر اسلامی حکومت کے زیرِ نگیں نہیں آجاتا اور یہ جنگ پہلی جنگ سے زیادہ مشکل نہیں ہو گی کیونکہ جب ہمارے پاس کوئی ایرپورٹ نہیں تھا، کوئی شہر نہیں تھا اور کوئی باضابطہ حکومت نہیں تھی اُس وقت اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے ساتھ ہم نے افغانستان کے کسی خطہ میں روسی فوجوں اور روس نواز عناصر کو ٹکنے نہیں دیا تو اب جبکہ جنوبی افغانستان میں ہماری حکومت قائم ہو جائے گی تو باقاعدہ حکومتی جنگ میں شمالی افغانستان کی مجوزہ کمیونسٹ حکومت کو شکست دینا ہمارے لیے نسبتاً زیادہ آسان ہو گا بلکہ اس صورت میں روس کے زیرِ تسلط ان مسلم علاقوں تک ہماری رسائی ہو جائے گی جنہیں خالی کر کے روس اس نئی کمیونسٹ ریاست میں شامل کرے گا اور اس طرح بخارا، تاشقند اور دوسرے مسلم علاقوں کو روس کی غلامی سے نجات دلانے کے دیرینہ خواب کی تکمیل کی راہ بھی ان شاء اللہ العزیز ہموار ہو گی۔

مولانا حقانی سے ہمارا تیسرا سوال یہ تھا کہ افغان مجاہدین کی جنگ نے عالمِ اسلام میں جہاد کے ولولہ کو ایک بار پھر زندہ کر دیا ہے، لیکن کیا جہادِ افغانستان کا دائرہ صرف افغانستان تک محدود ہے یا اس سے ہٹ کر دنیائے اسلام میں جہاد کے جذبہ کو بیدار کرنے کا تصور بھی موجود ہے؟

اس کا جواب اُن کی طرف سے یہ تھا کہ نہیں ہمارے جہاد میں وطنیت کا تصور نہیں ہے ہم نے وطن کی جنگ نہیں لڑی بلکہ کفر کے نظام کے خاتمہ اور اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کے لیے جہاد کیا ہے جو ہمارا شرعی فریضہ تھا اور یہ جہاد صرف افغانستان کے لیے نہیں بلکہ پورے عالمِ اسلام کے لیے ہے اس لیے افغانستان میں اپنے اہداف حاصل کرنے کے بعد ہمارا جہاد ختم نہیں ہو جائے گا بلکہ عالمِ اسلام کے مسائل کو حل کرنے کے لیے ہم جہاد کے اس جذبہ کو عالمگیر تحریک کی شکل دینے کی کوشش کریں گے۔ ہمارے سامنے کشمیر کا مسئلہ ہے بھارت کے مظلوم مسلمانوں کا مسئلہ ہے مسجدِ اقصیٰ کا مسئلہ ہے مظلوم فلسطینی مسلمانوں کی آزادی کا مسئلہ ہے۔ بخارا، تاشقند اور دیگر مقبوضہ مسلمانوں کا مسئلہ ہے یہ سارے مسائل جہاد کے ذریعہ ہی حاصل ہوں گے، اور افغانستان میں کامیابی کے بعد ہمارے جہاد کے آئندہ اہداف انشاء اللہ العزیز یہی علاقے ہوں گے۔

ذہن میں کئی سوالات اپنی باری کے انتظار میں قطار باندھے کھڑے تھے لیکن حقانی صاحب کے دروازے پر ملاقات کے خواہشمند وفود اور افراد کی قطار اس سے کہیں زیادہ لمبی نظر آئی، اس لیے ہم نے سوالات کا سلسلہ مختصر کرتے ہوئے پاکستان کے علماء کیلئے پیغام کی درخواست کی ——— مولانا جلال الدین حقانی نے کہا کہ پاکستان کے علماء سے میری گذارش یہ ہے کہ وہ ملتِ اسلامیہ کے لیے جہاد کی اہمیت اور ضرورت کا ادراک کریں اور اس شرعی فریضے کے احیاء کے لیے اپنی فکری و عملی صلاحیتوں کو کام میں لائیں۔ جہادِ افغانستان شروع ہونے کے بعد پاکستان کے تمام علماءِ کرام کی ذمہ داری تھی کہ وہ اس کی حمایت کے لیے متحرک ہو جاتے اور اس کے ذریعہ پاکستان کے مسلمانوں میں جہاد کے جذبہ اور عمل کو زندہ کرتے لیکن ایسا نہیں ہوا اور پاکستانی علماء نے اس طرف توجہ نہیں دی۔ (حرکۃ المجاہدین کے امیر مولانا فضل الرحمن خلیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اب اس نوجوان کو دیکھو، خدا اس کو سلامت رکھے اور دارین کی سعادتوں سے نوازے کہ یہ اس مقصد کے لیے مسلسل متحرک ہے اور شب و روز محنت میں مصروف ہے، ایسا سب علماء کو کرنا چاہیئے تھا۔ اب بھی وقت ہے اور جہاد خود پاکستان کے علماء کی ضرورت ہے، ان کے سامنے اپنے وطن کی حفاظت، بھارت کے مسلمان، کشمیر، الحادی قوتوں کی سرگرمیاں اور نفاذِ اسلام کی جدوجہد جیسے مسائل موجود ہیں اور ان کے حل کے لیے جہاد کے جذبہ اور عمل کے احیاء کی ضرورت ہے۔ پاکستان کے علماء کو چاہیئے کہ وہ اس ضرورت کا احساس کریں، اپنے مدارس میں طلبہ کا جہاد کے لیے ذہن تیار کریں، خطبات و مواعظ میں جہاد کی شرعی حیثیت اور فضائل کا کثرت کے ساتھ ذکر کر کے اپنے اردگرد جہاد کا ماحول بنائیں اور افغان مجاہدین اور مہاجرین کی حمایت و امداد کے لیے منظم مہم چلا کر جہادِ افغانستان کو تقویت پہنچانے کے ساتھ ساتھ اپنے ملک کی رائے عامہ کی جہادِ اسلامی کیلئے ذہن سازی کریں۔ جہاد ایک شرعی فریضہ ہے اور عالمِ اسلام کے مسائل و مصائب کا واحد حل ہے اور امت کو جہاد کے لیے تیار کرنا علماء کی ذمہ داری ہے اگر وہ اس ذمہ داری کو پورا نہیں کریں گے تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سرخرو نہیں ہو سکیں گے۔

UF
ہر گھر
ہر دفتر
کی زینت
یونی فوم

دفتر ہو، یا فیکٹری
دوکان ہو، یا گھر

شیشہ
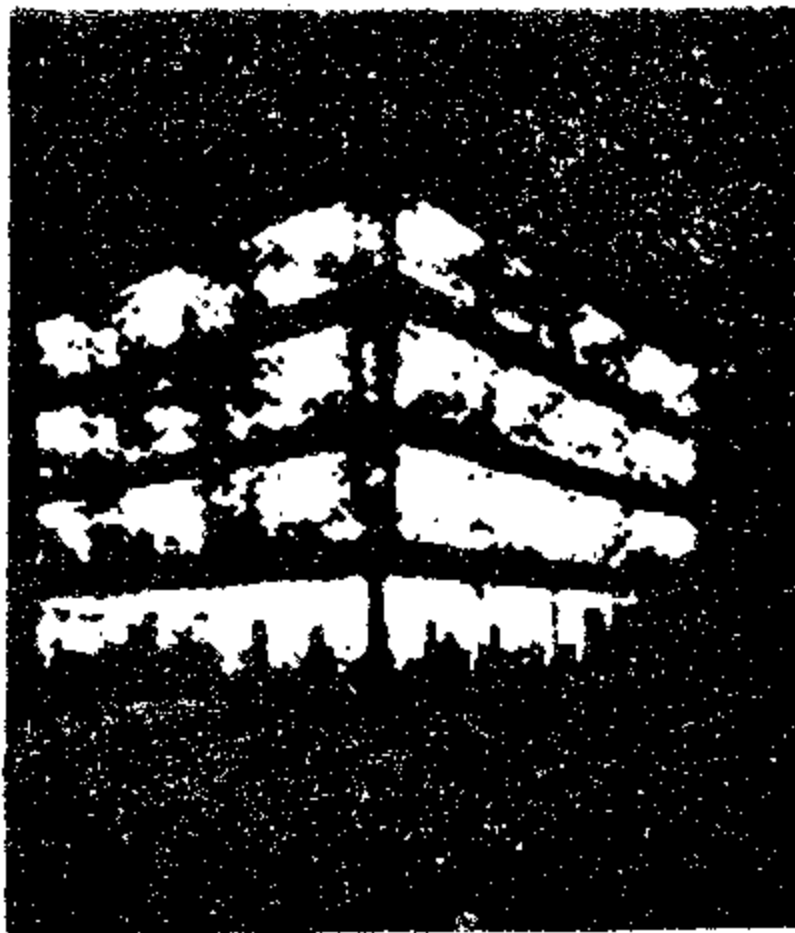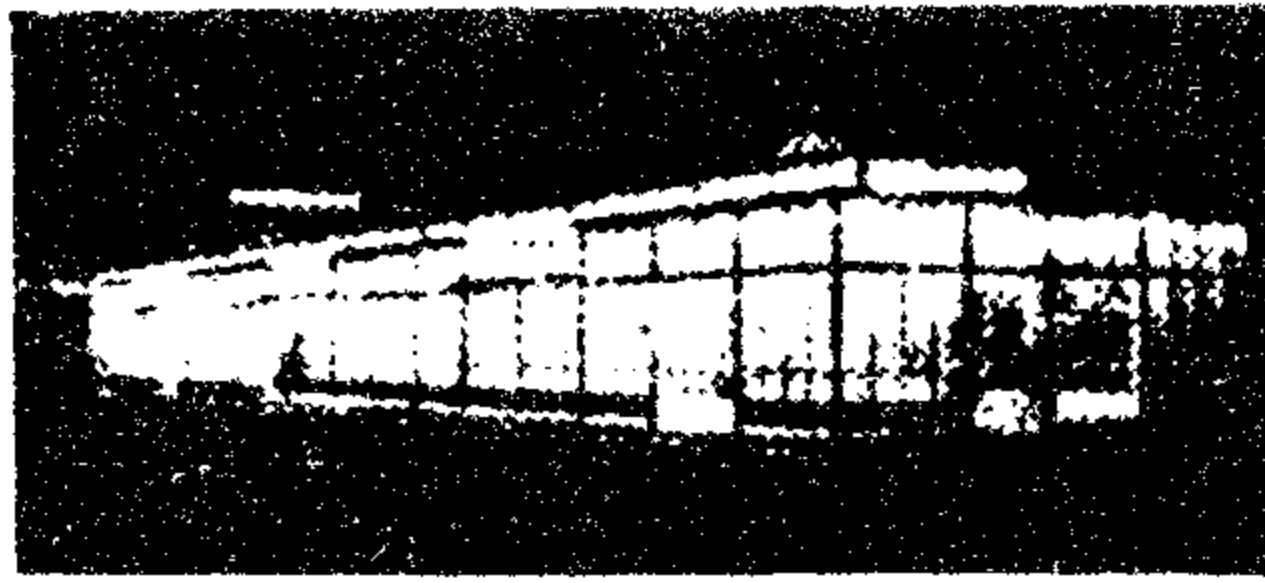
خواجہ کا

خواجہ گلاس انڈسٹریز لمیٹڈ
شاہراہ پاکستان ——— حسن ابدال

فیکٹری آفس: ۱۰۰۔ ہارلے اسٹریٹ، صدر، راولپنڈی
رجسٹرڈ آفس: ۳۔ ایبٹ روڈ، لاہو

جناب ابوالراقم انصاری
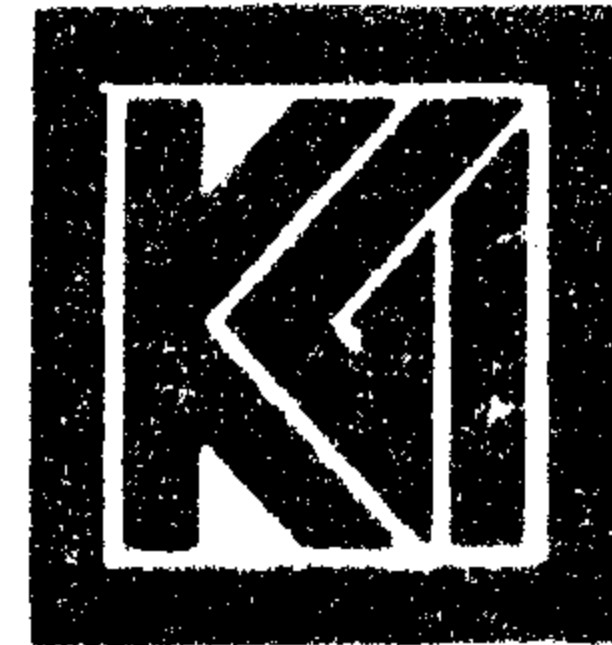
حرمین مقدس پر قبضہ کرنے کے لئے تازہ ترین شیعہ سازش

اس سے قبل کہ حرمین الشریفین پر قبضہ کرنے کے لئے ایران کی تازہ ترین اور خوفناک ترین سازش بیان کی جائے پچھلے چودہ سو سالہ تاریخی جائزے کا لب لباب سامنے رکھنا ضروری ہے۔ گذشتہ تاریخ اسلام کے مطالعہ کا نچوڑ یہ ہے کہ جب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اسلام کا عملی قیام وجود میں آیا تو اسی وقت سے عالمی یہودیت نے اسلام کے خلاف سازشیں شروع کر دیں مقصد یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح اسلام کے "سیاسی مرکز" اور اسلام کے "روحانی مرکز" دونوں کے وجود کو مٹا دیا جائے۔ اس غرض سے ہزاروں سال پرانی اور سازشی یہودیت نے ابن سبا یہودی کے بطن سے شیعہ مذہب کو جنم دیا تاکہ مسلمانوں میں اختلاف و افتراق کے ذریعہ اسلام کی متحدہ قوت، منظم اجتماعیت اور مستحکم مرکزیت کو سبوتاژ کیا جا سکے۔ لہذا ابن سبا یہودی نے اپنے شیعوں کے ساتھ پہلا قدم اسلام کے "سیاسی مرکز" کو متزلزل کرنے کے لئے اٹھایا۔ ان اہل تشیع نے مرکزی خلافت وقت کے عملی اقدام کی ابتدا اس طرح کی کہ خلیفۂ وقت سیدنا عثمان ذوالنورین کو عین ماہ حرام (ذوالحجہ ۳۵ھ) میں اور حدود حرم نبوی کے اندر ذبح کر دیا۔

یوں یہود اور آل یہود نے پہلی مرتبہ مل کر نہ صرف سیاسی مرکز اسلامیہ پہ ہاتھ اٹھایا بلکہ مسلمانوں کے حرم مقدس کی حرمت پر بھی ہاتھ صاف کیا۔ اولین دشمنان اسلام کی یہی دو دھاری تلوار آج تک مسلسل استعمال ہوتی چلی آ رہی ہے پچھلی چودہ صدیوں میں ایک طرف تو خلافت راشدہ، خلافت بنو امیہ، خلافت عباسیہ اور آخری خلافت عثمانیہ کی عالمی مرکزیت یکے بعد دیگرے ختم کی جاتی رہی ہیں۔ تو دوسری جانب حرمت حرمین بھی وقتاً فوقتاً روندی جاتی رہی ہے۔ جب آخری عالمی خلافت عثمانیہ ۱۹۲۴ء میں ختم کر دی گئی جو دنیا میں واحد سپر پاور بھی تھی اور اسلام کا "سیاسی مرکز" بھی تھی اس کے بعد بھی یہودیت اور شیعیت کی مشترکہ قوت اسلام کے "روحانی مرکز" (حرمین محترم) کی تسخیر اور تباہی پر لگ گئی۔ اس دوسرے مرحلے میں سب سے پہلے ۴۸ء میں اسرائیل کی ناجائز ولادت عمل میں لائی گئی۔ اور فوراً ہی اسرائیلی وزیراعظم بن گوریان نے باقاعدہ اعلان کر دیا کہ یہود جس خطۂ زمین سے ماضی میں نکالے گئے تھے یعنی حرمین، اس پر وہ قبضہ کر کے رہیں گے۔ اس یہودی اعلان کے ساتھ ساتھ ہی آل یہود کے خمینی کا یہ اعلان بھی اس کی کتاب "کشف الاسرار" کے

کے ذریعہ سامنے آیا۔ کہ جب صاحب الامر ظاہر ہوں گے تو وہ مکہ اور مدینہ پر قبضہ کریں گے۔ پھر ابوبکرؓ و عمرؓ اور عائشہؓ کو قبروں سے نکال کر انہیں سزا دیں گے۔ اور پھر تمام سنیوں (یعنی مسلمانوں) کو قتل کر دیں گے۔

ان یہودی و شیعی یکساں عزائم کے ساتھ یہ دشمنانِ اسلام آگے بڑھتے رہے۔ اور بالآخر ۶۷ء میں قبلۂ اول (بیت المقدس) پر یہود قابض ہو گئے۔ ۴۸ء اور ۶۷ء کی منازل طے کرنے کے بعد آج تک یہود اور آلِ یہود اب آخری منزل یعنی تسلط حرمین کی جانب پیش قدمی کر رہے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ۷۹ء میں خمینی کی انقلابی حکومت ایران میں قائم ہوئی اور اسی سال سے حرمین شریفین میں حملوں اور ہنگاموں کا سلسلہ شروع ہو گیا جو ہر سال ایام حج میں ۸۷ء تک جاری رہا۔ بہرحال یہودی ماسٹر کا یہ شیعی ہراول دستہ اپنے اس ضمنی مقصد میں ناکام رہا۔ کہ مسلمانوں کا روحانی مرکز بھی ان کے سیاسی مرکز کی طرح تباہ و برباد کر دیا جائے یعنی یہ کہ مسلمانانِ عالم کی روحانی مرکزیت بھی ٹھیک ان کی سیاسی مرکزیت کی طرح دنیا سے مٹا دی جائے۔

۲۔ جولائی ۸۷ء کی آخری ناکامی و نامرادی کے بعد یہودی آقا کے اشارے پر خمینی نے نیا منصوبہ بنایا جس کے تحت دنیا بھر میں ایرانی سفارت خانے حج کانفرنس اور حج سیمینار منعقد کر رہے ہیں اور جہاں یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ مکہ اور مدینہ کو کھلا شہر قرار دیا جائے اور بین الاقوامی کنٹرول میں دیا جائے۔

یہ نئی اور گہری چال بڑی کثیر الجہت ہے۔ مثلاً اس سے تو مملکت حرمین دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر کمزور ہو جائے گی میزبانِ حرم کی ذلت و خواری ہو گی۔ مسلمانوں میں انتشار و خلفشار کی دائمی لہر پیدا ہو جائے گی۔ اور گذشتہ نو برسوں کی شیعہ ہنگامہ آرائی اور قتل و غارت گری حرمین میں سالانہ کی بجائے روزانہ کا معمول بن جائے گی۔ اس تازہ سازشی مطالبے کا اصل مقصد یہ ہے کہ حرمین کے روحانی مرکز کو ایک اکھاڑہ بنا دیا جائے۔ تاکہ باہم اکھاڑ پچھاڑ سے وہاں نہ مسلمان سلامت رہے اور نہ ہی مسلمانوں کا قبلہ و کعبہ باقی رہے۔ چونکہ خمینی کا دعویٰ تو یہ ہے کہ پوری دنیا میں صرف ایک ہی ملک ایران ”اسلامی“ ہے اور باقی سب ممالک ”طاغوتی“ ہیں۔ لہٰذا ہونا تو یہ چاہیے کہ قم اور تہران کو کھلا شہر قرار دیا جائے تاکہ دنیا کا جو مسلمان جب چاہے وہاں ویزہ وغیرہ کے بغیر چلا جائے۔ آخر خمینی اپنے ایرانی مقاماتِ مقدسہ کو کھلا شہر کیوں نہیں بناتا؟ وجہ صاف ظاہر ہے کہ وہ دنیا کے تمام مسلمانوں کو بے عقل اور بے وقوف سمجھتا ہے اور اپنی تازہ شیطنت کا شکار کرنا چاہتا ہے۔

۳۔ بیان کردہ کھلے حقائق کے علی الرغم چند بھولے بھالے مسلم عناصر سمجھے بوجھے بغیر خمینی کے نئے دام میں گرفتار ہو ہی گئے ہیں۔ ان سادہ لوح حضرات کی خدمت میں عرض ہے کہ اگر وہ پیش کردہ گذارشات کے باوجود شیعہ خباثت کا ادراک نہ کر سکے ہوں تو کم از کم اب ذرا خمینی کی تازہ ابلیسی اسکیم کے مہلک مضمرات پر ہی غور فرما لیں۔ انشاء اللہ انہیں خمینی کی یہودی شیطنت کے متعلق شرح صدر حاصل ہو جائے گا۔ اولاً یہ کہ حرمین کو کھلا شہر قرار دینے کا مطلب و مفہوم کیا ہے؟

یہ ہی نا کہ کسی ویزہ ، پاسپورٹ ، چیکنگ اور حساب کتاب کے بغیر حرمین میں آمد و رفت کی آزادی ہو۔ جس کا جی چاہے وہاں داخل ہو جائے۔ یعنی یہ کہ وہاں بس ایک میلہ لگا رہے۔ کہ جو جاہے پہنچ جائے۔ اور تماشہ دیکھ کر یا تماشہ دکھا کر رخصت ہو جائے۔ وہاں نہ کوئی روک ٹوک ہو اور نہ کسی قسم کی مداخلت و ممانعت ہو۔

مطلب یہ ہوا کہ حرمین میں سرے سے کوئی نظم نہ ہو اور عمرہ جیسی اہم زیارت اور حج جیسی فرض عبادت میں لاکھوں کا مجمع بدنظمی اور افراتفری کے نذر ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ ایسی عجیب وغریب صورت حال میں وہاں کون کون اور کیسے کیسے لوگ پہنچ سکتے ہیں۔ اور کیا کچھ جرائم کر سکتے ہیں۔ اس کا اندازہ ہی ہولناک ہو گا۔ تیسرے یہ کہ جہاں یہ معلومات ہی نہ ہوں کہ کب اور کتنے افراد کہاں کہاں سے مکہ اور مدینے چلے آئیں گے۔ تو وہ کونسا کمپیوٹر ہو گا جو ان کے قیام و طعام اور دیگر ضروریات کے تمام انتظامات کر سکے گا۔ چوتھے یہ کہ اگر مکہ و مدینہ کھلے شہر ہو گئے تو جدہ جو باہر سے آنے والوں کی پہلی منزل بھی ہے اور گذر گاہ بھی اور وہ تمام مقامات جو مکہ اور مدینہ کے درمیان گذر گاہیں ہیں۔ ان کی حکومت و انتظامیہ نگہبانی اور نگرانی کا فریضہ کیونکر انجام دے گی۔ اور اگر مقامی انتظامیہ کا عمل دخل ہو گا تو کس حد تک۔ پانچواں نکتہ انتہائی توجہ طلب یہ ہے کہ کھلا شہر ہونے کی وجہ سے جب حرمین محترم میں ہر شخص کو مادر پدر آزادی حاصل ہو جائے گی تو وہاں کیسے کیسے سیاسی، گروہی، علاقائی، نسلی اور لسانی مفادات، مظاہرے اور پروپیگنڈے ہوں گے جس کے نتیجہ میں باہمی تصادم ہوتے رہیں گے اور جن کی روک تھام مشکل ہی نہیں، ناممکن ہو جائے گی۔

چھٹا نکتہ بھی بہت اہم ہے اور وہ یہ کہ جب کھلے شہر میں کھلی چھٹی ہو گی تو دنیا کے درجنوں مسلم لیڈروں کے نام اور نعرے حرمین میں بلند کئے جائیں گے اور یقیناً ان کی تصاویر بھی وہاں لگائی جائیں گی۔ جہاں خود آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سابقہ انبیاء کی تصویروں تک کو حرم کی دیواروں سے صاف کیا تھا۔ وہاں معمولی اور وقتی لیڈروں کی تصویریں پھیلی ہوئی ہوں گی۔ پابندیوں کے ہوتے ہوئے تو وہاں خمینی ہر سال نہ صرف اپنی بت نمائی کراتا ہے بلکہ صدائے لبیک اللہم کی بجائے "لبیک یا خمینی" کے کافرانہ نعرے لگواتا ہے۔ چنانچہ پابندیاں اٹھنے کی صورت میں تو وہ بیت اللہ الحرام میں مزید حرام کام کرے گا۔ اور بالآخر وہاں اللہ کی عبادت کی بجائے صرف اپنے بت کی پوجا و پرستش کرائے گا۔

ساتواں اور آخری نکتہ یہ ہے۔ کہ حرمین مکرم پر بین الاقوامی کنٹرول کی تجویز خام خیالی بھی ہے اور رواہی تباہی بھی مضحکہ خیز بھی ہے اور معنی خیز بھی۔ اور ناقابل قبول بھی ہے اور ناقابل عمل بھی۔

بفرض محال اگر حرمین کو بین الاقوامی نگرانی میں دیا بھی جائے تب بھی یہ ناممکن ہو گا کہ نگران بین الاقوامی ادارہ حرمین پر یورش کرنے والے موجودہ فسادیوں کو ان کے روز افزوں فتنوں سے باز رکھ سکے۔ کیونکہ عالمی تنظیم اقوام متحدہ تک اسرائیل اور ایران اپنا یہ متفقہ فیصلہ آج تک نہ منوا سکی ہے کہ وہ دونوں مسلم عرب پر زور و زبردستی، ظلم و زیادتی اور قتل وغارت گری روا نہ رکھیں۔ مسلم بلاد عرب کے مختلف خطوں کو ہڑپ نہ کریں اور پورے مسلم مشرق وسطی کو اپنے جنگی

جنون کا نشانہ نہ بنائیں۔ لہٰذا حرمین میں بھی کوئی بین الاقوامی ادارہ آل یہود (اہل تشیع) کی یہودی پشت پناہی کے ساتھ جاری شدہ بدامنی اور بداعمالیوں کو کنٹرول نہیں کر سکے گا۔ پھر قطع نظر اس کے کہ بین الاقوامی نگہداشت کی مجوزہ اسکیم نہایت پیچیدہ اور بے ہودہ ہے۔ یہ کلیتہً ایک کھلی سازش ہے کہ ملک حرمین کے اندرونی معاملات میں بیرونی مداخلت کی جائے اور ریاست در ریاست کے قیام سے پوری اسلامی ریاست کو منہدم کر دیا جائے۔ یہ دراصل ایک خوشنما چال ہے جس کے ذریعہ سے عیار یہودی و خمینی کی خواہش ہے کہ سعودی اور غیر سعودی مسلمانوں کو حرمین سے بے دخل ہی نہ کریں بلکہ وہیں ان کا مکمل صفایا بھی کر دیں۔ اور پھر اس روحانی مرکز اسلام پر قبضہ کر کے پورے ہی عالم اسلام کی بھی اینٹ سے اینٹ بجا دیں۔

۴۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ آخری مرتبہ جولائی ۸۷ء میں خمینی ٹیم نے حرم مکہ میں سینکڑوں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی مگر پھر بھی قبضہ حرم کی پرانی سازش میں مزید منہ کی کھائی۔ چنانچہ اگلے ہی ماہ یعنی اگست ۸۷ء میں خمینی نے متبادل منصوبہ بنا لیا اور جگہ جگہ اس مطالبے کا چکر چلایا۔ کہ مکہ اور مدینہ کو "کھلے بین الاقوامی" شہر قرار دیا جائے۔ ہر چند کہ چند ماہ تک یہ مہم زور شور سے چلتی رہی۔ لیکن متوقع کامیابی اب تک حاصل نہ ہو سکی۔

مطلب یہ ہے کہ اب دنیا کے مسلمان بالعموم خمینی کا یہ نیا شوشہ و شاخسانہ سمجھ گئے۔ اور دھوکہ دہی کے اس پھندے میں پھنس نہیں سکے۔ علاوہ ازیں ان ہی حالیہ چند ماہ کے دوران دنیا کے بے شمار علمائے اسلام نے شیعیت و خمینیت کے کفر ہونے کے فتاویٰ جاری کر دئے۔ جن کی تصدیق و توثیق کرتے ہوئے عالم اسلام کے شیخ الاسلام اور مفتیٔ اعظم سعودی عرب الشیخ عبدالعزیز بن باز نے خمینی کے خارج از اسلام اور مرتد ہونے کا فتویٰ بھی صادر فرما دیا اور جس کی تائید رابطۂ عالم اسلامی کے عالمی اجلاس منعقدہ اکتوبر ۸۷ء نے بھی کر دی۔

(بحوالہ اخبار المسلمون، مکہ مکرمہ ۱۶ اکتوبر ۸۷ء۔ ماہنامہ الفرقان لکھنؤ، خصوصی اشاعت اکتوبر تا دسمبر ۸۷ء ماہنامہ بینات کراچی، خصوصی اشاعت جنوری و فروری ۸۸ء۔ ماہنامہ اقرار ڈائجسٹ کراچی، شیعیت نمبر فروری ۸۸ء)

عالم اسلام کے اس خصوصی ردِ عمل کو خمینی نے ایک چیلنج کی حیثیت سے لیا اور جواباً و فوراً اس نے اپنا تازہ ترین منصوبہ مرتب کرنا شروع کر دیا۔ جس کے آثار بتا رہے ہیں کہ وہ حرمین پر حملے کا خوفناک ترین اور ہولناک ترین حربہ ثابت ہو سکتا ہے۔

۵۔ سرغنۂ آل یہود خمینی نے اپنے تازہ ترین سازشی پلان کے تانے بانے جنوری ۸۸ء میں بننے کا آغاز کیا اور اس کی حکومت نے اعلان کیا کہ آئندہ جولائی ۸۸ء کے حج کے موقعہ پر تقریباً دو لاکھ ایرانیوں کو حرمین کے لئے روانہ کیا جائے گا طریق واردات کا پورا اندازہ تو اسی سے ہو جاتا ہے کہ ایرانیوں کا اتنا بڑا غول یقیناً تعداد کے اعتبار سے ایک نیا عالمی ریکارڈ ہو گا۔ پھر یہ کہ طریق واردات کی سنگینی کا ثبوت بھی جلد ہی مل جاتا ہے اور وہ یہ کہ ایرانی وزیر اعظم کی بیوی

خانم زہرہ موسوی نے ۱۸ فروری ۸۸ء کو ایرانی کلچرل سینٹر لاہور میں پریس کانفرنس کے ذریعہ علی الاعلان کہہ دیا ہے کہ اس سال بھی حج کے دوران "ایرانی زائرین" حرمین میں وہی کچھ کریں گے جو پہلے کرتے رہے ہیں (روزنامہ ڈان کراچی ۱۹ فروری ۸۸ء)

ان اعلانات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جولائی ۸۸ء میں حرمین میں نقب زنی اور تباہی کے لئے خمینی نے بہت بڑے پیمانے پر تیاری کر لی ہے۔ یعنی یہ کہ احرام حج کے لبادے میں اس مرتبہ ایران کے اسرائیلی تربیت یافتہ کمانڈوز کی دو لاکھ فورس حرمین پہنچ کر وہ زبردست تخریب کاری کرے گی۔ جس کی تاریخ میں کوئی مثال نہ ہوگی۔

قبضۂ حرمین کی تازہ ترین شیعہ سازش کے مقابل دفاعی تدابیر تدارک: پیش کردہ حقائق و دلائل کے پیش نظر یہ بات توطے ہے کہ آج ملت اسلامیہ کے مرکز اسلام (حرمین) کو تاریخ کا بدترین خطرہ درپیش ہے۔ اگر ایران کے مذکورہ دو لاکھ دو لاکھ منظم کمانڈوز کی حرمین تک رسائی ہوجائے تو وہاں اتنی بڑی تعداد کے جنگ جو اور ہلاکو کمانڈوز کی ہلاکت خیزی کو روکنا ممکن نہ ہوگا۔ لہٰذا قبل اس کے کہ وہ سنگین ترین منظر ہلاکت رونما ہو، ایسی حکمت عملی اختیار کرنی ہوگی جس سے آنے والے ابلیسی ریلے کو حرمین میں داخل ہونے سے روکا جاسکے۔

وقت کا اولین تقاضہ یہ ہے کہ مسلمان اپنی شیعوں کے ساتھ بے جا رواداری کو ترک کردیں۔ اس لئے کہ ماضی بعید ہو یا ماضی قریب امت اسلامیہ اپنی اس طویل و بے معنی رواداری کا مزہ بھی خوب چکھ چکی ہے۔ اور اپنی سادگی و سادہ لوحی کی سزا بھی بہت بھگت چکی ہے۔ ماضی و حال کے تمام واقعات، تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں واحد راہِ عمل صرف یہ نظر آتی ہے کہ اسلامیان ان دشمنان سے رواداری جیسی کمزوری کو رفع کرلیں۔ اپنی تن آسانی و سہل انگاری کو ختم کرلیں اور کامل ہمت و جرأت سے کام لیں۔ تقاضائے وقت کے ضمن میں دوسری ضرورت یہ ہے کہ مسلمان دنیا میں اپنے عظیم منصب اور اس کی عظیم ذمہ داری کے احساس کو اجاگر کریں۔ بالفاظ دیگر وہ اس ازلی عطیہ الٰہی اور دنیا کے اولین مرکز عبادت و ہدایت کی پاسبانی کا عظیم حق ادا کریں۔ جو آج اغیار کے نرغے میں ہے۔

ارشاد الٰہی ہے کہ "بے شک دنیا کا سب سے پہلا گھر جو انسانوں کی عبادت کے لئے بنایا گیا وہ وہی ہے جو مکہ میں ہے اور جو تمام دنیا کے لئے برکت و ہدایت کا مرکز ہے" (آل عمران آیت ۹۶)

اللہ تعالیٰ نے اپنے بیت الحرام کی تعمیر انسان اول و نبیٔ اول آدم علیہ السلام سے ہی پھر ابراہیم علیہ السلام سے اس کی تجدید کرائی۔ اور آخر میں خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اس کو ہمیشہ کے لئے عالم اسلام کے واسطے دائمی قبلہ و کعبہ اور مرکز و محور بنا دیا۔ کیونکہ جس قطعۂ زمین پر یہ بیت اللہ ہے وہ بھی پورے کرۂ ارض کا مرکزی نقطہ ہے۔ اس طرح اس اہم ترین اور اعلیٰ ترین مقام حرم کا محافظ مسلمان کو بنایا گیا۔ لہٰذا اسے فرائض منصبی کا گہرا شعور پیدا کرنا چاہئے اور ان اہم فرائض کی بجا آوری کے لئے دینی غیرت اور ملی حمیت کو بروئے کار لانا چاہئے۔ موجودہ نازک حالات کا تیسرا اور آخری

تقاضہ یہ ہے کہ جملہ پاسبان وخادمانِ حرمین پوری توجہ سے حفاظتِ حرمین کے متعلق ۷۹ سے لے کر ۸۰ء تک کی اپنی اپنی کوتاہیوں وغلطیوں کا خود احتساب کرلیں اور عہد کرلیں کہ نہ صرف ان کا اعادہ نہیں کیا جائے گا بلکہ ان کا ازالہ بھی کیا جائے گا ان تین محکم تیاریوں کے ساتھ خمینی کی سازش کو لپیٹنے کے لئے مندرجہ ذیل تین نکاتی اقدامات بھی لازمی ہیں۔

۱۔ تمام مسلمانانِ عالم تامل وتاخیر کے بغیر شیعیت وخمینیت کے پیروکاروں کی طے کردہ حیثیت (بموجب مذکورہ متفقہ فتویٰ علماء وفیصلہ عالمی اسلامی اجلاس اکتوبر ۸۷ء) کو قانونی شکل دینے کے لئے انفرادی واجتماعی طور پر راہ ہموار کریں۔ اور تمام مسلم ممالک جملہ اہلِ تشیع کو آئینی طور پر غیر مسلم اقلیت قرار دیں۔

۲۔ چونکہ قرآن وحدیث کے مطابق حدودِ حرمین میں غیر مسلموں کا داخلہ بھی ممنوع ہے اور وہاں فسوق وجدال اور فتنہ وفساد بھی بدرجہ اولیٰ ممنوع ہیں۔ اور چونکہ ایرانی شیعہ ان دونوں خصوصیات کے حامل ہیں۔ لہٰذا ان کے داخلۂ حرمین کی فوری وقطعی ممانعت کردی جائے۔ یہی فوری پابندی دیگر تمام ممالک کے اہلِ تشیع پر بھی عائد کی جائے۔ اس لئے کہ ان کی ساری وفاداری اور اتباع واطاعت بھی صرف اور صرف اسی ایک مرکزِ شیعیت سے وابستہ ہوتی ہیں۔

۳۔ چونکہ ایران کا سرکاری مسلک ومذہب شیعیت بھی غیر اسلامی ہے اور ایرانی حکومت کا حرمین مقدس پر مسلسل حملوں کا عمل بھی صریحاً خلافِ اسلام ہے چنانچہ ان دونوں بیّن وجوہات کی بناء پر ایران کو اسلامی سربراہی کانفرنس کی تنظیم (O.I.C) سے خارج کردیا جائے۔

مختصراً یہ ہیں وہ تدابیر تدارک اور دفاعی لائحہ عمل جن پر فوراً عمل درآمد کرکے قبضہ حرمین کی تازہ ترین خمینی سازش کو یقیناً ناکام کیا جاسکتا ہے اور امت اسلامیہ کے مرکز ومحور اور قبلہ وکعبہ کو یہود اور آلِ یہود (اہل تشیع) کی دیرینہ دستبرد سے ہمیشہ کے لئے محفوظ کیا جاسکتا ہے۔ اگر ہم مسلمانانِ عالم نے اللہ تعالیٰ کی اس اولین بیت الحرام کا دفاع کرلیا تو ربِ کعبہ بالیقین ہم کو دنیا میں بھی سرخرو کرے گا اور آخرت میں بھی۔ بصورت دیگر یہاں کا انجام بھی اور وہاں کا انجام بھی معلوم!

حافظ محمد ابراہیم حقانی فانی
مدرس دارالعلوم حقانیہ

یاد رفتگان
آخری قسط

سیر بوستاں

شیخ القرآن حضرت مولانا عبدالہادی صاحب شاہ منصوری قدس سرہٗ

خصائل و خصوصیات آپ کو اللہ تعالیٰ نے جن اوصاف حمیدہ سے نوازا تھا اس کا احاطہ تو مشکل ہے۔ کیونکہ آپ کی قد آور شخصیت ہر لحاظ سے ہمہ جہت تھی۔ صرف چند خصوصیات کا ذکر یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ ع

سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کے لئے

عشق رسولؐ حدیث شریف میں ارشاد نبویؐ ہے۔ کہ لا یومن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس او کما قال۔ یعنی جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کہلاتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کی محبت حضرت سید المرسلین کے ساتھ تمام کائنات سے زیادہ ہو۔ ہمارے حضرت الشیخ قدس سرہ اس معاملے میں بالکل اسی حدیث پر عمل پیرا رہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی والہانہ محبت اور ذات قدسی کے ساتھ آپ کا عاشقانہ تعلق رہا۔ فرماتے کہ :۔

جس سال ہم حج بیت اللہ شریف کے لئے گئے تھے تو جب ہم زیارت روضۂ اطہر کے لئے جاتے۔ وہاں پر علماء نجد ہمیں زیارت سے روکتے اور کہتے کہ آپ تو حج کے لئے آئے ہیں۔ زیارت کے لئے نہ جائیں۔ ہم ان کی باتوں کو ان سنی کر دیتے فرماتے کہ ؎

خاک یثرب از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

اور ؎ کے بود یارب کہ رو در یثرب و بطحا کنم گہ بمکہ منزل و گہ در مدینہ جا کنم

فرماتے ہیں کہ مسئلہ زیارت النبیؐ کے لئے سفر میں جمہور اہلسنت اور امام ابن تیمیہ و شیخ ابو محمد الجوینی کے درمیان اختلاف ہے ان کے نزدیک زیارت النبیؐ کے لئے سفر کرنا حرام ہے اور لا تشد الرحال الحدیث اپنے لئے بطور استشہاد پیش کرتے ہیں۔ جب کہ جمہور اہل سنت کی طرف سے علامہ سبکی۔ قاضی شوکانی۔ قاضی عیاض اور محدث کشمیری نے ان کے مستدل سے جواب دیا ہے فرمایا کہ مولانا عبدالرحمٰن جامی رحمہ اللہ جب مدینہ منورہ سے رخصت ہو رہے تھے تو مواجہ شریف میں جا کر عرض کرتے ع

بسفر می روم چہ فرمائی

روضۂ اقدس سے جواب ملتا۔ بسلامت روی و باز آئی۔

کئی بار آپ نے اس طرح کیا۔ آخری بار جب آپ نے عرض کیا تو روضۂ اقدس سے جواب نہیں ملا۔ آپ سمجھ گئے کہ اس کے بعد مجھے یہ سعادت نصیب نہ ہوگی۔

فرماتے ہم تو عاشق ہیں۔ ہمارا ان سوالات وجوابات سے کیا کام۔ سلف صالحین اور خلف ماہرین فی الدین سے متواتر سفر برائے زیارت النبی صلی اللہ علیہ وسلم منقول ہے۔ پھر پرجوش والہانہ انداز میں فرماتے ع

احمد تو عاشقی بمشیخت ترا چہ کار

شغف بالقرآن | جس شخص نے زندگی کے پورے اسٹھ سال قرآن اور تفسیر قرآن میں گذارے ہوں۔ اس سے زیادہ انہماک فی القرآن اور شغف بالقرآن اور کیا ہوسکتا ہے۔ دورۂ تفسیر کے اختتام پر طلبہ کو منجملہ اور نصائح کے یہ بھی فرماتے کہ طالب علمو! جاؤ اور اپنے اپنے مواضعات اور شہروں کی غیر آباد مساجد کو قرآن اور ترجمہ و تفسیر قرآن سے آباد کرو۔ تاکہ ان غیر آباد مساجد سے توحید کے عطر بیز زمزمے اور قال اللہ اور قال الرسول کے دل آویز نغمے گونج اٹھے

آپ رزق کی طرف سے بالکل بے فکر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے رزق کا ذمہ خود لیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔ ان اللہ ہو الرزاق ذو القوۃ المتین۔ خداوند قدوس جب کافر و ملحد و زندیق اور دہریوں کو رزق دیتا ہے تو وہ شخص جو اس کی کتاب کی خدمت کرے اسے لوگوں تک پہنچائے اس کی غیرت یہ کس طرح برداشت کرسکتی ہے کہ وہ تلاش معاش میں سرگردان و پریشان رہے۔ شیخ سعدی فرماتے ہیں ؎

اے کریمی کہ از خزانۂ غیب | گبر و ترسا وظیفہ خور داری
دوستاں را کجا کنی محروم | تو کہ با دشمناں نظر داری

پھر فرمایا کہ قرآن کریم کی اس آیت کا ورد بلاناغہ کریں۔ ویرزقہ من حیث لا یحتسب ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ ان اللہ بالغ امرہ قد جعل اللہ لکل شیٔ قدرا۔ اللہ تعالیٰ آپ پر رزق و آسائش کے دروازے اور آرام و راحت کے مخفی خزانے کھول دے گا۔ اور اس چیز کا مشاہدہ بچشم خود ہم نے حضرت الشیخ کے ہاں کیا۔ کہ بظاہر کسی قسم کے اسباب مہیا نہیں۔ لیکن آپ بالکل فارغ البال ہیں۔ اسی شغف بالقرآن کو دیکھ کر حضرت الشیخ کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ آپ فنا فی القرآن تھے تو بے جا نہ ہوگا۔ تصوف میں فنا فی اللہ اور فنا فی الرسول کے جو اصطلاحات رائج ہیں۔ اگر شیخ کی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو اس میں فنا فی القرآن کا اضافہ ناگزیر ہے اور اگر مجھے اجازت دی جائے تو میں اس بات میں حق بجانب ہوں کہ آپ اپنے نامۂ اعمال کے بجائے قرآن پیش کریں گے۔ جیسا کہ مشہور ہے کہ ا۔

حضرت شاہ عبدالقادر صاحب قدس سرہ نے جب اپنی تفسیر مکمل کی تو ایک شاعر کے شعر میں ترمیم کرتے ہوئے فرمایا کہ ؎

روز محشر ہر کسے در دست گیرد نامۂ
من نیز حاضر مے شوم تفسیر قرآں در بغل[1]

جیساکہ پہلے تمہید میں عرض کرچکا ہوں کہ اس سال جس سال بندہ خود دورۂ تفسیر میں شریک تھا۔ آپ ختم دورۂ تفسیر سے دو دن قبل سخت بیمار ہوئے۔ لیکن پھر اختتامی تقریب میں انتہائی ضعف اور کمزوری کے عالم میں شرکت فرمائی اور ساتھ ساتھ آخری تین سورتوں کی تفسیر بھی خود بیان کی۔ گذشتہ رمضان المبارک سے قبل پھر آپ پر بیماری کا شدید حملہ ہوا تھا۔ اور قرین قیاس یہ بات تھی کہ اب رمضان شریف آنے والا ہے اور آپ کی صحت انتہائی مخدوش ہے۔ شاید اس سال آپ دورۂ تفسیر نہیں پڑھائیں گے۔ لیکن ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب پندرہ شعبان کو آپ نے حسب معمول دورۂ تفسیر کا آغاز کیا۔ اور ۲۴ رمضان المبارک کو بخیر و خوبی اس کی اختتامی تقریب ہوئی۔ یہ حضرت الشیخ کا آخری اور الوداعی دورۂ تفسیر تھا۔ اور اس کے تقریباً تین مہینے بعد آپ کا سانحۂ ارتحال پیش آیا ؎

اے کہ دل از فکر آں می سوخت ہیم ہجر بود
آخر از بے مہری گردوں یاں ہم ساختیم

فرماتے۔ کہ ہماری دنیا اور اس کے بکھیڑوں سے کیا تعلق۔ اہل دنیا جانے اور ان کا کام آپ دیکھتے ہیں۔ صبح ہوتے ہی ہر شخص اپنے کام میں مصروف عمل ہو جاتا ہے جو زراعت پیشہ ہے۔ وہ کھیت کی طرف جو ملازم ہے وہ دفتر کی طرف جو مزدور ہے وہ اپنی مزدوری کے لئے الغرض ہر شخص اپنے مقرر کردہ وظیفہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور اس کے لئے تگ و تاز کرتا ہے لیکن ہمارا وظیفہ تو یہی قرآن ہے۔ پھر یہ شعر سنایا ؎

علی الصباح چوں مردم بکار و بار روند
بلا کشان محبت بسوئے یار روند

ہم تو بلاکشانِ محبت ہیں۔ ہماری محبت قرآن کے ساتھ ہے اس کے ساتھ ہمارا جینا اور ہمارا مرنا ہے ؎

جی میں آتا ہے کہ نکلے دم تمہارے سامنے
تم ہمارے سامنے اور ہم تمہارے سامنے

فقیری | آپ انتہائی فقیر منش اور درویش طبع انسان تھے۔ قرآن و ترجمہ قرآن اور حدیث یار کے ساتھ آپ کا شغل

---

[1] یہ شعر حاجی محمد جان قدسی المتوفی ۱۰۵۰ھ کا ہے اصل شعر یوں ہے ؎

روز محشر ہر کسے در دست گیرد نامۂ | من نیز حاضر می شوم تصویر جاناں در بغل
قدسی ندانم چوں شود سودائے بازار جزا | او نقد آمرزش بکف من جنس عصیان در بغل

(خاقانی)

رہا۔ انتہائی پرکیف اور وجد آگیں انداز میں فرماتے ؎

ما ہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الا حدیث یار کہ تکرار می کنیم

دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک پرکیف و پر لذت دینا عالم قناعت کی عشرت طرازیوں سے لطف اندوز ہوتے فرماتے۔ کہ اگر ان دنیا داروں کو ہماری لذت اندوزیوں اور فقیری میں شہنشاہی کا علم ہو جائے تو یہ لوگ رشک و حسد کی آگ میں جل جائیں گے۔ اور ہم سے اس لذت کے چھیننے کی از بس کوشش کریں گے لیکن ہم انہیں یہ کہتے ہیں ؎

شال زربفت تمہیں مبارک ہو اے دولتمندو
ہم کو کملی میں دوشالے کا مزا ملتا ہے

کبھی کبھی اپنے مخصوص انداز میں فرماتے کہ مولانائے روم نے کیا خوب کہا ہے ؎

اہل دنیا کافران مطلق اند
روز و شب درلق لق و دربق بق اند

دراصل حضرت الشیخ جیسی عظیم ہستیوں اور نابغۂ روزگار شخصیتوں کو ملک نیم شب کی لذت آشنائیوں نے دنیوی جاہ و جلال اور ظاہری حسن و جمال سے بیگانہ کر دیا تھا جیسا کہ حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ کو ملک سنجر کے بادشاہ نے صوبہ نیمروز کے حاصلات ان کے لنگر کے لئے وقف کرنے کی درخواست کی۔ تو آپ نے اس کی درخواست کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ اور درخواست کے دوسری طرف آپ نے یہ قطعہ لکھا ؎

چوں چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد
در دل اگر بود ہوس ملک سنجرم
زانگہ کہ یافتم خبر از ملک نیم شب
من ملک نیم روز بیک جو نمی خرم

مہماں نوازی | حضرت الشیخ قدس سرہ میں دیگر اوصاف حمیدہ کے علاوہ یہ صفت بھی بدرجہ اتم موجود تھی۔ عالم اسلام کے نامور مفکر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ شیخ الاسلام حضرت سیدنا حسین احمد مدنی قدس سرہ کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

"ضیافت مہمان نوازی اور اطعام طعام ان کی روحانی غذا اور طبیعت ثانیہ بن چکی تھی۔ پھر مہمانوں کے ساتھ وہ جس تواضع اور انکساری اور جس اعزاز و احترام کے ساتھ پیش آتے تھے اس کو دیکھ کر قدیم عرب شاعر کا یہ شعر بے اختیار یاد آتا تھا ؎

وانی لعبد الضیف ما دام نازلاً
وما شیمة لی غیرها تشبه العبدا

"میں مہمان کا غلام ہوں۔ جب تک وہ میرے گھر میں مہمان رہے اور زندگی کا یہی ایک موقعہ ہے جس میں میں غلام معلوم ہوتا ہوں"۔

ہمارے حضرت الشیخ ان الفاظ کے صحیح مصداق اور مظہر اتم تھے۔ بندہ نے بچشم خود حضرت الشیخ کے ہاں یہ مشاہدہ کیا ہے کہ روزانہ اوسطاً بیس پچیس مہمان آتے ہیں اور حضرت بہ نفس نفیس ان کی خدمت اور تواضع میں مصروف ہیں پورے اکسٹھ برس تک دورۂ تفسیر کے دوران آپ کی مسجد میں جو طلبا رہائش پذیر ہوئے ان کی تعداد جتنی بھی ہوتی خواہ ستّر یا اسّی۔ آپ کے گھر سے ان کے لئے افطاری اور سحری کا انتظام ہوتا۔

ایک دفعہ راقم اپنے گھر زروبی (جو کہ شاہ منصور سے تقریباً ۲ کلو میٹر جانب شمال واقع ہے) میں دوپہر کے کھانے کے بعد اکوڑہ خٹک آرہا تھا۔ راستے میں خیال آیا کہ حضرت الشیخ کی زیارت اور ملاقات سے شرف یاب ہو جاؤں چونکہ فاصلہ تھوڑا تھا۔ اس لئے راستے میں کسی قسم کی تاخیر نہ ہوئی۔ اس وقت دوپہر کے تقریباً ساڑھے بارہ بجے تھے میں نے حضرت الشیخ کے دروازے پر دستک دی۔ آپ کے دونوں صاحبزادگان مولانا نور الہادی اور برادرم فیض الباری صاحبان گھر میں موجود نہ تھے۔ گھر سے ایک لڑکا آیا۔ میں نے کہا کہ اگر حضرت الشیخ محو استراحت نہ ہوں تو بندہ ان کے ساتھ ملاقات کا خواہشمند ہے اور ساتھ ساتھ لڑکے کو اپنا نام بھی بتایا۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت خود تشریف لائے اور ہاتھ میں پانی کا لوٹا ہے۔ مجھے بیٹھک میں بٹھایا اور گھر تشریف لے گئے۔ تھوڑی دیر بعد آئے اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ حضرت کے پاس مجمع (ٹرے) ہے اور اس چھوٹے لڑکے کے پاس روٹی کا خوان ہے۔ یہ منظر دیکھ کر میں نے عرض کیا کہ حضرت میں گاؤں سے کھانا کھا کر آیا ہوں۔ لیکن حضرت کے اصرار کے سامنے مجال انکار نہ تھی۔ پھر آپ نے بندہ کے ساتھ اکٹھا کھانا تناول فرمایا۔ اپنے دل میں اس وقت آنے پر از حد شرمندہ ہوا۔

فیاضی فیاض ازل نے آپ کو جیسا قناعت پسند اور سیر چشم دل عطا فرمایا تھا۔ اسی طرح آپ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم الید العلیا خیر من الید السفلی کے مصداق تھے۔ اگر کوئی عالم یا طالب علم آپ کی ملاقات اور زیارت کے لئے جاتا۔ تو اس کو نقدی کی صورت میں ضرور کچھ نہ کچھ عطا فرماتے۔ جو کچھ آپ دیتے ہزار کوشش کے باوجود اس کو واپس لینے پر آمادہ نہ ہوتے۔ فرماتے! یہ آپ کا کرایہ ہے۔ آپ دور سے آئے ہیں۔ ابو الطیب متنبی اپنے ممدوح مغیث بن علی بن بشر عجلی کے بارے میں کہتا ہے۔

اقل من عمر ما یحوی اذا وھبا	عمر العدو اذا لاقاہ فی رھج
فکن معادیہ او کن لہ نشبا	توقہ فاذا ما شئت تبلوہ

و کلما لقی الدینار صاحبه فی ملکه افترقا من قبل یصطحبا

مالٌ کان غراب البین یرقبه فکلما قیل هذا مجتدٍ نعبا

"ترجمہ: یہ شخص وہ ہے جب وہ غبار جنگ میں اس کے سامنے آجاتا ہے۔ اس کے سال سے جب وہ بخشنے لگے کمتر ہوتی ہے۔ اے مخاطب تو اس کی دشمنی سے بچ۔ اگر تو آزمانا چاہتا ہے اس کو۔ تو یا اس کا دشمن بن جا یا مال۔ اور جب اس کی ملکیت میں ایک دینار دوسرے سے آملتا ہے۔ تو وہ قبل اس کے کہ ایک دوسرے کے ساتھ ہم صحبت ہوں۔ متفرق ہوجاتے ہیں اس کا مال ایسا ہے کہ گویا جدائی کا کوا اس کی تاک میں لگا رہتا ہے۔ سو جب کہا جائے کہ یہ سائل ہے تو وہ کوا بول پڑتا ہے۔"

درحقیقت ہمارے شیخ کا مال دنیا کے ساتھ ایسا ہی معاملہ تھا اور الحمد للہ آج ان کے صاحبزادگان اپنے جلیل القدر والد صاحبؒ کے نقش قدم پر چلتے ہیں اور اپنے عظیم والد کی تابندہ روایات کو زندہ رکھنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔

توکل | حضرت الشیخ کو اللہ نے جس وصف سے بدرجۂ اتم متصف فرمایا تھا وہ توکل تھا۔ اور ایسا توکل و استغنا جو کہ اصحاب عزیمت ہی کا خاصہ ہے۔ چنانچہ اس بارے میں کسی دلیل وحجت کی ضرورت نہیں بلکہ جس شخص نے آپ کی درویشانہ زندگی کا مشاہدہ کیا ہے۔ اس پر آپ کی یہ صفت نمایاں انداز میں آشکارا ہوگئی ہے۔ زمانہ طالب علمی ہی سے آپ کے برادر محترم مولانا عبدالباقی مرحوم نے آپ کو زمین کے بارے میں کچھ کہا کہ اس کو اجارہ یا مزارعت پر دے دیں گے تو آپ نے فرمایا کہ ہم اس زمین کو ختم کریں گے تاکہ ہمارا کوئی ظاہری سہارا نہ رہے۔

فرمایا۔ کہ زمانۂ طالب علمی ہمارے پاس کچھ رقم جمع ہوگئی تھی۔ والد صاحب کا سایہ تو سر سے اٹھ چکا تھا۔ ہاں بڑے بھائی حیات تھے اور وہ بھی طالب علم۔ بعض احباب نے مشورہ دیا کہ اس رقم سے آپ زمین رہن لے لیں کیونکہ آپ طالب علم ہیں کسب معاش کے لئے فارغ نہیں۔ اور اس زمین سے آپ کا کام چلے گا۔ رہن کا اس لئے کہتے کہ اس وقت ہمارے علاقے میں یہ دستور تھا کہ زمین بیع قطعی طور پر فروخت نہیں کی جاتی تھی۔ مگر ہم انتفاع بالمرہونہ کی حرمت کی وجہ سے۔ یہ اقدام نہیں کرسکتے تھے۔ مگر احباب کی بار بار ترغیب کی وجہ سے ہم نے آپس میں یہ مشورہ کیا کہ بڑے بھائی دیوبند چلے جائیں وہاں چونکہ علامہ انور شاہ صاحب کشمیری چاروں مذاہب کے ماہر ہیں اگر ان مذاہب میں سے کسی بھی مذہب میں انتفاع بالمرہونہ جائز ہو تو پھر احباب کی دلجوئی کی خاطر ہم یہ کام کریں گے۔

شاہ صاحب نے بھائی صاحب کو فتویٰ دیا کہ انتفاع بالمرہونہ بلا اجازت اور بلا اجازت دونوں صورتوں میں جائز نہیں۔ کبھی کبھی درس میں آپ اس واقعہ کا ذکر فرماتے۔ سورہ بقرہ میں فرہانٌ مقبوضہ میں رہن پر بحث کے دوران۔ اور اس موقعہ پر صاحب شرح وقایہ پر عجیب انداز میں رد فرمایا کرتے۔ فرماتے، کہ وہ کہتے ہیں کہ با اجازت

مرتہن انتفاع بالمرہونہ جائز ہے۔ آپ کہتے کہ یہ غلط ہے کیونکہ آپؐ کا قول کل قرض جر نفعا فہو ربا کے منافی ہے۔

آپ نے طویل تدریسی زندگی گزاری۔ اور اس دوران ہم نے بظاہر ایسا کوئی سبب معلوم نہیں کیا جو کہ آپ کے لئے ذریعہ آمدنی ہو۔ اور نہ کسی متمول ملک کے ساتھ آپ کے کسی قسم کے روابط تھے۔ آپ کے بڑے صاحبزادے مولانا نورالہادی صاحب اپنے والد صاحب اور طلبہ کی خدمت میں کوشاں رہتے۔ اگر آپ چاہتے تو اپنے لئے اور اپنے صاحب زادوں کے لئے بہت کچھ کر سکتے تھے۔ لیکن آپ نے درویشانہ زندگی کو ترجیح دیتے ہوئے الفقر فخری پر کاربند رہے۔

سازِ عشق آپ چونکہ بحر ذخار معرفت کے غواص وادیٔ سلوک اور کوچۂ تصوف کے راہی تھے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو دل دردمند اور جگر پرسوز سے نوازا تھا۔ آپ کا قلب سوز و سازِ عشق سے معمور اور ذوق و شوق سے مخمور تھا۔ موقعہ بموقعہ اپنی اس قلبی کیفیت کا اظہار دل گداز اور دلنشیں اشعار کی صورت میں فرماتے۔

ایک دفعہ بندہ خود ان کی مجلس میں بیٹھا تھا۔ آپ اپنی بیٹھک میں تشریف فرما تھے۔ اس دن آپ کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ آپ بھی خاموش اور ہم بھی ساکت۔ مجھے ان کے صاحبزادے مولانا نورالہادی نے اشارہ کیا کہ آپ "جی" کے ساتھ کچھ مشغول ہو جائیں۔ میں نے پہلے تدلیت ولعل سے کام لیا۔ پھر خود دل میں خیال آیا کہ آپ سے کچھ مستفید ہوں میں نے عرض کیا۔ حضرت آپ کو تکلیف نہ ہو تو مجھے محمد علی حزیںؔ کے اس شعر کا مطلب سمجھا دیں۔ آپ نے فرمایا پڑھو۔ کیا کہتا ہے۔ میں نے عرض کیا ؎

شادم کہ از رقیباں دامن فشاں گذشتی
گو مشت خاک ماہم برباد رفتہ باشد

آپ نے فرمایا دوبارہ پڑھو۔ میں نے دوبارہ پڑھا۔ پہلے تو آپ تکیہ سے ٹیک لگائے تشریف فرما تھے، پھر بیٹھ گئے۔ چہرے کی رنگت بدل گئی۔ آنکھوں سے آنسو کا سیلاب امڈ آیا۔ بات کرنا چاہتے تھے لیکن آنسو کی وجہ سے آواز گلوگیر ہو جاتی۔ دل میں سوچا کہ میں نے تو آپ سے اس کا مطلب اس لئے پوچھا تھا کہ آپ کچھ فرمائیں اور اس طرح رنگِ محفل جم جائے۔ لیکن کیا خبر تھی کہ آپ پر ایسی کیفیت طاری ہو گی۔

پھر فرمایا کہ اگر اس کے اور اشعار آپ کو یاد ہوں تو وہ پڑھیں۔ میں نے عرض کیا ؎

اے وائے بر اسیرے کزیاد رفتہ باشد	در دام بستہ باشد صیاد رفتہ باشد
آواز تیشہ امشب از بے ستوں نیاید	گویا بخواب شیریں فرہاد رفتہ باشد
شادم کہ از رقیباں دامن فشاں گذشتی	گو مشت خاک ماہم بر باد رفتہ باشد

کچھ دیر کے لئے آپ ان اشعار کو دہراتے اور عجیب کیفیت سے مخمور تھے۔ پھر جب آپ کی یہ حالت سنبھل گئی تو فرمایا۔ کہ اہلِ دل اور اہلِ ذوق کمال کرتے ہیں۔ بس یہی تمہید باندھی۔ کہ اتنے میں کچھ مہمان آپ کی ملاقات کے لئے حاضر

ہوئے اور یوں ہم آپ کی گوہر افشانیوں سے محروم ہوگئے۔

مذاق شاعری ملکہ شعر انسان کی اندرونی کیفیات و احساسات کا ترجمان ہوتا ہے۔ اظہار کا اعلیٰ ذریعہ اور ذوق و وجدان کی تسکین کے لئے بہترین سامان ہے۔

عارف باللہ ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب عارفیؒ قدس سرہ اپنے اشعار کے بارے میں فرماتے ہیں ؎

یہ مرے اشعار یہ جذباتِ قلب بے قرار ہیں میرے وجدانِ حسن و عشق کے آئینہ دار

شاعری ہے میری تنہائی کا ایک شغلِ لطیف اپنی بزم دل کا خود ساقی ہوں خود ہوں میگسار

جب ہوا کچھ کیف دل میں پڑھ لئے دو چار شعر پھر بقدر ذوق ان کو پڑھ لیا دو چار بار

ہمارے حضرت الشیخ کو خداوند قدوس نے شعر و شاعری سخن سنجی اور سخن فہمی کا بہترین نفیس لطیف اور اعلیٰ ذوق عطا فرمایا تھا۔ فارسی اور پشتو کے قادر الکلام شاعر تھے اور اس کے علاوہ دیگر شعراء کے ہزارہا اشعار آپ کی نوک زبان تھے بموقع و مناسبت سے والہانہ ترنم کے ساتھ ان اشعار کو سناتے۔ خود بھی اس میں محو ہو جاتے۔ اور دوسروں پر بھی اپنے ساتھ اس نئی دنیا کی سیر کراتے۔

ایک دفعہ دورانِ درس جب کہ اس دن آپ کی طبیعت ناساز تھی ایک طالب علم نے آپ سے شعر کا تقاضا کیا تو آپ نے فرمایا کہ :۔

کیف یأتی النظم لی والقافیہ بعد ما ضاعت اصول العافیہ

تو اس شعر کا آپ کا مطالبہ بھی پورا کیا اور اپنا عذر بھی بیان فرمایا جیسا کہ میں نے عرض کیا آپ کو ہزارہا اشعار یاد تھے کثرت سے جن اشعار کا ذکر کرتے اس میں بھی مجھے انتخاب مشکل ہے البتہ بطور مشت نمونہ خروار۔ یہ چند اشعار جو کہ آپ کے شعری ذوق کے آئینہ دار ہیں۔ قارئین کی نذر ہیں۔

اپنی تسہیل ترمذی کے بارے میں فرماتے ہیں :۔

طبع شد تسہیل ترمذی شریف مختصر تطبیق بروجہ لطیف

منتہی را علم گرداند مزید منتہی در منتہا سازد شدید

علم او منقول از اسلاف شد زاں سبب مقبول در احناف شد

تسہیل ترمذی میں ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

از بہائے تو اے جگر گفتم یا برگرش کہ مختصر گفتم

بجوانانِ ناجحِ کابل بتضرع دعا کنم کامل

بہمہ طالبانِ جملہ سلام گوید آں خادم القرآں مدام

علاوہ ازیں دیگر شعرار کے کلام میں سے اکثر یہ شعر وردِ زبان ہوتے ؎

؎ ابتدار سازم بنام پاک آں بے ابتدار در رہِ ادراک او ہر عقل را عجز انتہار

؎ حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد روئے گل سیر ندیدم و بہار آخر شد

؎ چوں رفت از دست خم و جام ساقی بما جز غم نماندہ ہیچ باقی

؎ ترا دنیا چناں در قید کردہ کہ مرغِ جانت ایں جا صید کردہ

؎ دمادم مے کشد چوں اژدہائے کہ دیگر مے نیابی زور ہائے

؎ ما قصۂ دارا و سکندر نخواندہ ایم از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

؎ ہنگام تنگ دستی در عیش کوش ہستی کہ کیمیائے ہستی قارون کند گدا را

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

؎ کے بود یارب کہ رو در یثرب و بطحا کنم گہ بمکہ منزل و گہ در مدینہ جا کنم

؎ کس نداند کہ منزل گہہ آں یار کجا ست ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

؎ در بند ایں مباش کہ مضمون نماندہ است صد سال مے تواں سخن از زلف یار گفت

؎ اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم وز ہر چہ گفتہ اند شنیدیم و خواندہ ایم

؎ عمر تو مانند ہمیان زر است روز و شب مانند دینار اشمر است

؎ اطلس عمرش بمقراضِ شہور پارہ پارہ کرد خیاط غرور

؎ نیم نانے گر خورد مردِ خدا بذلِ درویشاں کند نیمے دگر

؎ بر آستانِ تو غوغائے عاشقاں چہ عجب کہ ہر کجا شکرستاں بود مگس باشد

خوش است بادۂ رنگین و صحبتِ جاناں مدام حافظ بیدل دریں ہوس باشد

؎ عمرِ دنیا چند روزے بیش نیست غافل است آنکس کہ دور اندیش نیست

؎ ہمچو صوفی در لباسِ صوف باش از صفت ہائے خدا موصوف باش

؎ در غربت اگر مرگ رسد در بدن من آیا کہ کند گور کہ دوزد کفن من

تابوت مرا سوئے بلندی بگذارید شاید کہ رسد بوئے وطن در بدنِ من

؎ خدایا ناسپاسی نیست لیکن ندانم ہجر تا کے صبر تا چند

؎ بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات با درد کشاں ہر کہ در افتاد بر افتاد

گر کند آہنگ ظلمے بادشاہ سودمند نہ بود ورا گنج و سپاہ

؎ از ستم ہر کو دلے را ریش کرد	آں جراحت بر وجودِ خویش کرد
؎ بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگامِ دعا کردن	اجابت از درِ حق بہرِ استقبال مے آید
؎ صبحِ صادق مرہمِ کافور دارد در بغل	گر علاجِ زخمِ عصیاں مے کنی بیدار باش
؎ بے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید	کہ سالک بے خبر نبود زراہ و رسمِ منزلہا
؎ غرض نقشے ست کز ما یاد ماند	کہ ہستی را نمی بینم بقائے
؎ نوشتہ بماند سیاہ بر سفید	نویسندہ را نیست فردا امید
؎ دنیا ست باغِ کہنہ وانساں چوں نو گلند	ہر یک زِ شاخِ عمر کند باغباں جدا
بسیار خفتہ اند دریں خاک سیم تن	شاہانِ عروس بسے از جہاں جدا
؎ عباراتنا شتّٰی وحسنک واحد	وکلٌّ الیٰ ذاک الجمال یشیرُ
؎ لقد شرقت شموس الہدیٰ فی وجوہہم	وقدرہم فی الناس لایزال یعتلی
؎ صحاح حدیث المصطفیٰ وحسانہ	شفاء مجیب فلیزل منہ دائکم
؎ فقد اسمعت لونا دیت حیًا	ولکن لاحیات لمن انادی
؎ یغشون بینہم المودۃ والوفا	وقلوبہم محشوۃ لعقارب
؎ الارض تبجی اذا ما عاش عالمہا	متی یمت عالم منہا یمت طرف
؎ تجلی تری ذات کا سو بسو ہے	جدھر دیکھتا ہوں ادہر تو ہی تو ہے
؎ شالِ زربفت تمہیں مبارک ہوائے دولتمند	ہم کو کملی ہیں دو شالے کا مزا ملتا ہے

احترامِ اساتذہ اپنے اساتذہ کرام اور مشائخ کے ساتھ آپ کی انتہائی محبت تھی بلکہ یہ محبت اپنے شیخ فی التفسیر مولانا حسین علی صاحب اور شیخ فی الحدیث مولانا نصیر الدین غورغشتوی کے ساتھ عقیدت تک پہنچ گئی تھی ؎

قسم خدا کی محبت نہیں عقیدت ہے
دیا ہے دل میں بہت احترام ہے تیرا

آپ کا معمول یہ تھا کہ جب درس شروع کرتے تو ابتداء میں درود شریف اور اختتام پر دعا فرماتے اور اس میں ضرور اپنے اساتذہ اور مشائخ کا ذکر کرتے فرماتے کہ ہمیں جو فیض پہنچا ہے وہ انہی حضرات اور نفوس قدسیہ کی مرہونِ منت ہے اور ان کا ہم پر اتنا عظیم احسان ہے کہ اگر ہم تمام عمر ان کی خدمت گزاری کے لئے وقف کرتے تو بھی ہم ان کا حق ادا نہیں کر سکتے تھے۔ اب جب کہ وہ اس دنیا میں نہیں رہے اور ان کی خدمت نہیں کر سکتے تو ان کے رفع درجات کے لئے دست بدعا رہیں گے۔

طلبہ کے ساتھ شفقت | آپ ایک شفیق و مشفق شیخ اور طلبہ کے ساتھ محبت اور رحمت سے پیش آتے ۔ طلبہ کے سوالات کے جوابات انتہائی نرمی اور خندہ پیشانی سے دیا کرتے ۔ اور ان کو خوش کرنے کے لئے ہلکا پھلکا مزاح بھی فرماتے ۔ ایک بار درس قرآن کے ضمن میں فرمایا کہ آج کل بعض طلبہ بھی نسوار کے عادی ہیں ۔ منہ کو گندگی کے محل میں تبدیل کرتے ہیں ۔ اس پر ایک حاجی صاحب، جو درس قرآن میں شریک ہوتے تھے نے بھی نسوار کے بارے میں طلبہ کے حق میں کچھ سخت قسم کے الفاظ استعمال کئے ۔ اس پر حضرت الشیخ بہت غصہ ہوئے اور فرمایا کہ حاجی صاحب، طلبہ تو میرے بچے ہیں اور باپ کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کی سرزنش کرے ۔ آپ کو طلبہ کی سرزنش کا حق کس نے دیا ہے ؟

عوام الناس سے اجتناب | تزکیہ نفس کے لئے اصطلاح تصوف میں ان چار چیزوں کا ہونا ضروری ہے ۔ قلت کلام ۔ قلت منام ۔ قلت طعام اور قلت اختلاط مع الانام ۔ حضرت شیخ میں ہم نے ان چاروں صفات کا مشاہدہ کیا ۔ آپ ہمیشہ کے لئے عوام الناس سے کنارہ کش رہتے ۔ اور ان کے ساتھ زیادہ میل جول اور اختلاط کو روحانی ترقیات و فیوضات کے لئے از حد مضر سمجھتے ۔ فرمایا کرتے کہ طلبہ کی وجہ سے میرا تعلق عوام الناس سے آگیا ہے ۔ اگر یہ طلبہ نہ ہوتے تو میں ان کے ساتھ کسی قسم کا تعرض نہ کرتا ۔

فرمایا کہ حدیث "العین حق" کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ عین صالح اور عین فاجر دونوں تاثیر کرتی ہیں ۔ اول میں صلاح کی تاثیر کرتی ہیں ۔ اول میں صلاح کی تاثیر موجود ہے اور دوسری میں فسق و فجور کی ۔ فرمایا، کہ یہ تاثیر متجاوز ہوتی ہے اچھے اور صالح آدمی کی نظر کی وجہ سے بچوں میں صلاح اور فاسق و فاجر آدمی کی نظر کی وجہ سے فسق و فجور کی طرف مائل ہو جاتے ہیں ۔

اخلاق عالیہ | آپ خود بھی اخلاق عالیہ کے پیکر تھے اور طلبہ کو بھی خوش اخلاقی اور عالی ظرفی کی ترغیب دیتے اس آیت کریمہ کے ضمن میں "ولو کنت فظاً غلیظ القلب لانفضوا من حولک" میں فرمایا کہ یہاں پر خداوند کریم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خوش اخلاقی کی تعریف فرماتے ہیں ۔

چھوٹا ہو یا بڑا ہر ایک کے ساتھ آپ کا یکساں سلوک ہوتا ۔ اگر شدت بیماری کی وجہ سے آپ کو تکلیف بھی ہوتی تو بھی کسی ملنے والے پر ظاہر نہیں ہونے دیتے ۔ اور انتہائی خندہ پیشانی کے ساتھ اس کے ساتھ مصروف گفتگو رہتے ۔

جذبہ تبلیغ | آپ میں تبلیغ و ارشاد کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اور ہر وقت آپ کی یہ خواہش ہوتی کہ کسی طرح دین کا ایک مسئلہ لوگوں تک پہنچا دیں ۔ اس صفت میں آپ اپنے شیخ فی التفسیر مولانا حسین علی صاحب قدس سرہ کے مکمل پیرو تھے ۔ اپنے علاقے میں چھوٹے چھوٹے جلسوں میں باوجود ضعف و پیری اور نقاہت و کمزوری کے شرکت فرماتے ۔ اور اگر گھر پر کچھ مہمان آجاتے تو بھی ان کے ساتھ یہی دینی باتیں ، شریعت مطہرہ کی حکمتیں اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی تلقین ، یہی آپ کا اوڑھنا بچھونا تھا ۔

سادگی | آپ انتہائی سادہ مزاج تکلف و تصنع اور ظاہری نام و نمود سے کوسوں دور ۔ امور دینیہ میں غافل

اور دنیویہ میں نا واقف۔ حدیث شریف میں ارشاد ہے کہ:

اہلِ جنت کی اکثریت سادہ مزاج افراد پر مشتمل ہوگی۔ ایک دفعہ آپ تقریر فرما رہے تھے۔ فرمایا۔ میری طرف متوجہ ہوں۔ دو تین دفعہ یہ بات دہرائی۔ تمام حاضرین ہمہ تن گوش ہوتے کہ حضرت کونسی عجیب بات بتا رہے ہیں۔ فرمایا کہ آج کل ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور نماز نہیں پڑھتے۔ مجھے تو ایسے لوگوں پر تعجب ہے۔

اعتدال پسندی آج کل افراط و تفریط کا دور ہے۔ چھوٹے چھوٹے مسائل کفر و ایمان کے لئے مدار ٹھہرائے گئے ہیں۔ بندہ اس کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا۔ ان اختلافات کو دیکھ کر اسلام سے ناواقف شخص کے ذہن میں کس طرح اسلام کی طرف میلان پیدا ہوگا۔ حضرت الشیخ اس قسم کے افراط و تفریط سے ہٹ کر معتدل راہ پر گامزن تھے۔ باوجودیکہ وہ مسئلہ سماع الموتیٰ کے قائل نہ تھے۔ لیکن کبھی اس مسئلہ کو سٹیج کا مسئلہ نہیں بنایا۔ درس میں معمولی اشارہ کرتے کہ ہمارے امام حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ سماع الموتیٰ کے قائل نہیں۔ جب طلبہ آپ سے اس بارے میں سوال کرتے تو فرماتے۔ کہ آپ کی مرضی۔ میں نے تو آپ کو اپنے امام کا قول اور مسلک بتایا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی فرماتے کہ یہ مسئلہ حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین میں مختلف فیہا چلا آرہا ہے۔ اس لئے اس میں تشدد سے کام نہیں لینا چاہئے۔

نذرِ اشک یہ تو حضرت الشیخ کی عادات و خصائل کا ایک اجمالی خاکہ تھا اور اس میں زیادہ تر اپنے مشاہدات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ورنہ حضرت الشیخ ایک مجموعۂ محاسن تھے۔ آپ کی شخصیت کے بہت سے مخفی گوشے ہیں جن کا احاطہ نوکِ قلم سے نہیں کیا جا سکتا۔ بقولِ شاعر ؎

گر مصور صورتِ آں دلستاں خواہد کشید
لیک حیرانم کہ نازش راچساں خواہد کشید

آج وہ اس دنیائے آب و گل اور کاخ رنگ و بو سے رخصت ہوئے ہیں۔ مقدراتِ ازلیہ و تقدیر الٰہی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے آپ کی روح مبارک سے اتنا عرض ہے کہ ؎

دیدۂ سعدی و دل ہمراہ تست
تا نہ پنداری کہ تنہا میروی

خداوند قدوس آپ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ اور پسماندگان و تلامذہ پر آپ کے انوار و برکات کا نزول ہو ؎

نذرِ اشکِ بے قرار از من پذیر
گریۂ بے اختیار از من پذیر

یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الیٰ ربک راضیۃ مرضیۃ۔ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی ٥

مولانا عبدالقیوم حقانی

تعارف وتبصرہ کتب

کتاب الآثار | تالیف۔ امام محمد بن حسن الشیبانی۔ صفحات ۲۱۰۔ قیمت ۵۶ روپے
ناشر۔ ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ۔ اشرف منزل د/ ۴۳۷ گارڈن ایسٹ۔ کراچی

کتاب الآثار، امام محمد کی ہو یا امام ابو یوسف کی۔ یا امام زفر، امام حسن بن زیاد، امام حفص بن غیاث۔ امام محمد بن خالد یا امام حماد بن ابی حنیفہ کی ہو یہ درحقیقت امام اعظم ابو حنیفہؒ کی تصنیف ہے۔ جسے انہوں نے چالیس ہزار احادیث و آثار سے انتخاب فرمایا ہے۔ بعد میں ان کے تلامذہ نے اس کی روایت کرکے اپنی طرف سے اضافہ اور ترمیم کی جس کی وجہ سے اس کے نسخے تلامذہ کے نام سے مشہور رہے۔

کتاب الآثار میں صحابہؓ اور تابعین کے آثار کو فقہی ابواب پر جمع کیا گیا ہے۔ اس لئے اس میں احادیث مرفوعہ کے مقابلہ میں آثار موقوفہ بہت زیادہ ہیں۔ اس کتاب کا مقصد صحابہؓ اور تابعین کے آثار کو یک جا کرکے یہ دکھانا ہے۔ کہ جن احادیث کی آثار سے موافقت ہوتی ہے وہ معمول بہا ہیں۔ گویا صحابہؓ اور تابعین کے آثار احادیث رسولﷺ کے لئے شواہد اور دلائل ہیں جن کو جمع کیا گیا ہے۔ کیونکہ مختلف فیہ احادیث کے بارے میں صحابہ اور تابعین کا تعامل معیار اور حکم کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ وہ منشائے رسولﷺ اور احکام دین کے زیادہ عالم تھے۔ اسی طرح اگر صحابہؓ کے اقوال میں اختلاف ہو تو تابعین کا مسلک معیار ہوگا۔ اور ان کے آثار کی روشنی میں صحابہ کے اقوال کو دیکھا جائے گا۔ جب تابعین کے اقوال و افعال میں اختلاف ہوگا تو وجوہ ترجیح کی بناء پر بعض صحابہ کے اقوال کو ترجیح دی جائے گی۔ اسی مقصد کے لئے ائمہ نے علماء صحابہ و تابعین کے آثار کو مستقل طور سے مدون کیا۔ چنانچہ امام محمدؒ کی کتاب الآثار بھی اسی سلسلہ زریں کی ایک بنیادی کڑی ہے۔ اس کتاب میں ان اکابر واعیان صحابہ اور کبار تابعین کے اقوال و افعال اور فیصلے مروی ہیں جو صحابہ میں [illegible] وجت اور تابعین میں معروف اور ثقہ تھے۔

جب کسی مسئلہ میں صحابہ سے متضاد اور مختلف روائتیں ہوتی ہیں تو وہ طریقہ اختیار فرماتے ہیں جو اقرب الی التفقہ ہوتا ہے اور تابعین کے اختلاف میں ان ہی کی طرح خود بھی تفقہ فی الدین اور اجتہاد سے کام لیتے ہیں۔ جو ان کے شیخ امام ابو حنیفہؒ کے طریقے پر ہوتا ہے۔ اسی طرح حضرت ابن مسعودؓ کے اس مسلک کو اختیار کرتے ہیں جو ابراہیم

نخعی سے مروی ہوتا ہے لیکن اگر اس میں اپنی صوابدید اور تفقہ کے خلاف کوئی بات ہوتی ہے تو پھر امام نخعی کے قول کو بھی ترک کردیتے ہیں۔ اور صاف طور سے لا ناخذ بقول ابراہیم بل بقول فلاں وفلاں کہتے ہیں۔ کتاب الآثار کے علاوہ امام محمد کی دوسری کتابوں میں بھی ان کی یہ اجتہادی شان اور فقیہانہ فکر وبصیرت پائی جاتی ہے۔

ادارۃ القرآن نے کتاب الآثار کو وفاق المدارس کی نصابی ضرورت اور فی نفسہ کتاب کی اشاعت کی اہمیت کے پیش نظر بڑے اہتمام اور شاندار طریقہ سے شائع کیا ہے۔ احادیث اور آثار کے جدید اسلوب کے مطابق نمبر دیئے گئے ہیں۔ ابتداء میں ایک وقیع مقدمہ شائع کیا گیا ہے جس میں امام محمد کے حالات وسوانح کا اجمالی خاکہ درج ہے۔ اور آخر میں امام ابن حجر عسقلانی کا ۴۰ صفحات کا رسالہ نافعہ " الایثار فی معرفۃ رواۃ الآثار" بھی شامل کردیا گیا ہے۔

تدریسی اور تعلیمی اور نصابی ضرورت کے پیش نظر بہتر تھا کہ مولانا ابوالوفا افغانی کی تعلیق اور تحشیہ جو اگرچہ ناتمام ہے بھی شامل اشاعت کردیا جاتا جس کی افادیت اور اہمیت کا اندازہ وہی حضرات کرسکتے ہیں جنہوں نے ان کی علمی اور فقہی کاوشوں کو ائمہ احناف کی متعدد امہات کتب کی اشاعت میں دیکھا ہے۔

مولانا ابوالوفا نے نہایت عقیدت اور بڑی دقت نظر سے اس کا تحشیہ فرمایا ہے۔ آثار کی تخریج، ان کی اسانید کی تحقیق، متضاد آثار میں تطبیق، غریب لغات کا حل۔ نیز یہ کہ امام محمد نے اپنی دوسری تصنیفات میں فلاں باب میں کیا ذکر کیا ہے اور ائمہ فقہا کی تفریعات کیا ہیں۔ رواۃ احادیث وآثار کے تذکرے۔ الغرض مولانا مرحوم کی فقہی بصیرت اور تحقیقی کاوش کی اشاعت سے کتاب کی افادیت اور بھی بڑھ جاتی۔

مولانا ابوالوفا، تحشیہ کے ناتمام ہونے کی شکایت اور توجہ اپنی جگہ درست ہے تاہم مولانا ابوالوفا کی وفات کے بعد جمہور احناف کے ذمہ یہ قرض ہنوز باقی ہے۔ دیکھئے یہ سعادت کس کے مقدر میں آتی ہے بہرحال ادارۃ القرآن کی یہ اشاعت ہر لحاظ سے قابل قدر ہے۔ (ع ق ح)

ترکی، پاک و ہند کی تحریروں میں	پیش لفظ وترتیب: جناب حکیم محمد سعید صاحب، صفحات: ۱۰۸، قیمت: -/۳۵ روپے ناشر: ہمدرد یونیورسٹی پریس۔ ہمدرد سنٹر۔ ناظم آباد کراچی ۱۸

پیش نظر کتاب میں ترکی کے حالات اور واقعات پر مشتمل کتابوں کا ایک کتابیاتی جائزہ پیش کیا گیا ہے جو اب تک ہند و پاک میں لکھی جا چکی ہیں، جس میں ترکی اور برصغیر پاک و ہند کے باہمی تعلقات اور روابط اور تاریخی اقدار پر روشنی پڑتی ہے۔ علمی تحقیقی اور تاریخی موضوع پر کام کرنیوالوں کو مصادر و ماخذ کی نشاندہی کا فائدہ ہوتا ہے، جناب حکیم محمد سعید صاحب نے شروع کے پیش لفظ میں کتاب کی قدر و قیمت اور اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ ارباب تحقیق کے لئے اپنے موضوع پر پہلی کتاب اور گراں قدر تحفہ ہے۔ (ع ق ح)

حضرت مولانا محمد علی جالندھری | پروفیسر ڈاکٹر نور محمد غفاری ۔ قیمت ۳۲ روپے

ملنے کا پتہ :۔ مجلس تحفظ ختم نبوت حضوری باغ روڈ ۔ ملتان

حضرت مولانا محمد علی جالندھری رحمہ اللہ جس کو دنیا مجاہد ملت کے نام سے پہچانتی ہے ۔ قافلہ احرار کے وہ نامور سپوت ہیں جنہوں نے نبوت کاذبہ کو ہر محاذ پر سر دار و رسن اور بر سر بالائے بام للکارا ۔ تحفظ ختم نبوت کی پاداش میں بارہا زنداں کئے گئے اور ان کو ہر قسم کی تکالیف اور اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا ۔ مگر اس مرد درویش کے پائے استقلال میں کسی قسم کی لغزش پیدا نہ ہوئی ۔

زیر نظر کتاب جناب پروفیسر ڈاکٹر نور محمد صاحب غفاری نے ان کی شخصیت اور ان کے مجاہدانہ کارناموں پہ ترتیب دی ہے ۔ چونکہ مصنف کو حضرت مجاہد ملت کے ساتھ عشق کی حد تک عقیدت ہے اس لئے ہر سطر سے عشق و وارفتگی اور کیف و مستی ٹپکتی ہے ۔ کتاب ایک تاریخی دستاویز ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین ادبی شاہکار بھی ہے علاوہ ازیں اردو، عربی اور فارسی کے برمحل استعمال نے کتاب کی جاذبیت دو آتشہ کر دی ہے اور معنوی حسن کے ساتھ ساتھ ظاہری حسن سے بھی آراستہ ہے ۔ (محمد ابراہیم فانی)

کتاب الجنائز | مرتب :۔ محمد اقبال کیلانی ——— قیمت :۔ وقف للہ

ناشر :۔ حدیث پبلیکیشنز حضرت کیلیانوالہ ۔ براستہ علی پور چٹھہ ضلع گوجرانوالہ

زیر تبصرہ کتاب جنازے کے احکام و مسائل پر مشتمل ہے ۔ باب الموت والمیت سے قبل مرتب نے باب قبل المرض اور باب المرض والعیادۃ کا قیمتی اضافہ کیا ہے ۔ صفحہ ۱۶ پر اصطلاحات حدیث کا مختصر نقشہ بھی پیش کیا ہے ، تاکہ بقول مرتب ہمارا مقصد اصطلاحات حدیث کے بارہ میں مکمل معلومات فراہم کرنا نہیں بلکہ عام پڑھے لکھے حضرات جو علم حدیث سے لاعلمی کے باعث ہر حدیث کو بلا تامل ضعیف کہہ دیتے ہیں ، اُن کے ذہن سے یہ تأثر دور کرنا مقصود ہے کہ علم حدیث کوئی معمولی چیز نہیں بلکہ یہ ایک ایسا بحر بیکراں ہے جس پر بات کرنا ہر آدمی کے بس کی بات نہیں ۔ کتاب میں بعض جاہلی رسومات پر صحیح احادیث کی روشنی میں کڑی تنقید کی گئی ہے اور خلاف سُنّت رسومات اور بدعات کی نشاندہی بھی موجود ہے ۔ مرتب کتاب چونکہ مسلکاً اہلحدیث ہیں اس لیے کتاب میں جگہ جگہ اس کی جھلک بھی موجود ہے ۔ (نوٹ) ۳ روپے کے ٹکٹ برائے ڈاک خرچ بھیجکر کتاب منگوائی جا سکتی ہے ۔ (وفاقی)